دوپہر کا
نواب


صبیحہ رحمن
دوپہر کا خواب
۲



دھوپ کا نواب

صبیحہ رحمن

چترالی پبلیکیشنز

۲۹۔ حبیب بنک بلڈنگ اُردو بازار لاہور

ناشر: طاہر امین، منور امین

نگران — ایم اے زاہد

طباعت۔ قصور آرٹ پرنٹرز لاہور

قیمت — دس روپے

دوپہر کا نواب

صبیحہ رحمٰن

افسانے



ہفتۂ خواتین کے دوران مینا بازار پاکستان کے میلے میں بیگم صاحبہ سے گفتگو کا شرف (۱۹۷۶ء)

اِنتساب

محترمہ بیگم نُصرت بھٹو خاتونِ اوّل پاکستان جو گذشتہ کئی سال سے پاکستانی خواتین میں ایک ہمہ گیر انقلاب کے لیے اپنے نامور خاوند جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم پاکستان کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ محترمہ نصرت بھٹو کی دن رات کی ان کاوشوں سے اب ہر شعبۂ حیات میں عورتوں کا نہ صرف عمل دخل نمایاں ہو گیا ہے۔ بلکہ عورتوں کے حقوق کو تسلیم بھی کیا جانے لگا ہے۔ خواتین کے لیے خاتونِ اوّل کی اِن گراں بہا خدمات کے اعتراف کے طور پر میں اپنی یہ پہلی تصنیف خاتونِ اوّل پاکستان محترمہ نُصرت بُھٹو کے نام نامی سے منسوب کرتی ہوں۔

صبیحہ رحمٰن

دوپہر کا نواب

صبیحہ رحمن

۱ :- ساحرہ -

۲ :- خدشے -

۳ :- خالو جان -

۴ :- پیار کے دیپ -

۵ :- چاند جاگتا رہا -

۶ :- بھینٹ -

۷ :- سہارا -

۸ :- دوپہر کا خواب -

۹ :- عکس چلتے ہیں -

۱۰ :- روشنیوں کے سائے -

۱۱ :- خانقاہ -

۱۲ :- معمہ

۱۳ :- پامسٹ

۱۴ :- دوپہر کا نواب



خاتونِ اول بیگم نصرت بھٹو سے پرائم منسٹر ہاؤس میں ملاقات (۱۹۷۳ء)

کہنے کی بات

افسانہ ایک کہانی ہی تو ہے۔ صرف تحریر کا انداز اور اسلوب بیاں بدلنے سے کہانی نہیں بدل سکتی۔ انسان اگر غور کرے تو اسی ماحول کے اردگرد بہت سی چلتی پھرتی کہانیاں نظر آئیں گی۔ ایسے بکھرے ہوئے کردار دیکھے گا۔ جو ہر وقت سماج میں اپنے بھرپور عمل سے انقلاب برپا کرتے رہتے ہیں۔ اگر مشاہدہ قوی اور مطالعہ گہرا ہے، تو اسے قدم قدم پر ایسے کردار ملیں گے جنہیں اُجاگر کرنے سے معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

یہ افسانے میرے گہرے مشاہدے اور ماحول سے اخذ کردہ کرداروں کے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ کچھ سُنی ہوئی آپ بیتیاں ہیں جنہیں اپنے رنگ میں پیش کر رہی ہوں۔

بقول غالب ؏

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان افسانوں میں کرداروں کے نام بدلے ہیں اور مقام کا ذکر چھوڑ دیا ہے، اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ مقصد کردار نگاری ہے کسی پر نکتہ چینی نہیں۔ اگر کسی کو اس آئینہ میں اپنا عکس جمیل نظر آئے تو یہ محض اتفاق ہوگا۔ قاری جوں جوں پڑھتا جائے گا۔ اسے اپنے اِردگرد کردار چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ انہیں اپنانا یا چھوڑ دینا اس کا اپنا کام ہے۔ میرا کام وعظ نہیں۔ میں تو صرف ان دھبوں کی نشاندہی کر رہی ہوں جن سے انسانیت کی سفید اور مُجلّا چادر کو داغدار کر دیا ہے۔

صبیحہ رحمٰن

شکریہ

اُستادِ محترم جناب بشیر احمد صمصام کی بے حد ممنون ہوں جن کی راہنمائی اصلاح اور فیض تعلیم و تربیت سے میں اس قابل ہوئی کہ افسانوں کا یہ مجموعہ پیش کر رہی ہوں۔ اُستادِ محترم سے حاصل کیا گیا علم اور تجربہ میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

صبیحہ رحمٰن

"ساحرہ"

بہت خوب!

آپ بہت اچھا رقص کرتی ہیں۔ آپکا تعلق کس طائفہ سے ہے؟
جمیل نے پاس سے گزرتے وقت لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
شکریہ!!

میں پیشہ ور رقاصہ نہیں ہوں اور نہ ہی میرا کوئی طائفہ ہے یہ تو حرف شوق کا مظاہرہ ہے۔ لڑکی نے جواب دیتے ہوئے جمیل کی طرف دیکھا۔

آپ کی تعریف؟ جمیل نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

لڑکی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟

اگر جانتا تو آپ کو جواب دینے کی زحمت کیوں دیتا جمیل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس پر لڑکی نے خاص انداز سے کندھوں کو جھٹک کر کہا۔

تعجب ہے !!

آپ میرا نام نہیں جانتے ؟

جناب !! میں ساحرہ ہوں ——— ساحرہ ——— ! ہاں صرف ساحرہ !!

لوگ مجھے ساحرہ ہی کہتے ہیں ۔ اب یہی میرا نام ہے ۔

ساحرہ ! جمیل نے دہرایا ۔ واقعی تم ہو بھی ساحرہ !

ہاں !! ساحرہ یہ کہہ کر آگے چلی گئی ۔

مگر جمیل کے ذہن میں بے شمار سوال اُبھرنے لگے ۔ اس نے کافی کوشش کی کہ وہ ساحرہ کے متعلق اتنی شدت سے نہ سوچے ۔ اس نے اخبار کو سامنے رکھ کر چاہا کہ اس کی توجہ ساحرہ کے خیال سے ہٹ جائے ۔ لیکن ساحرہ کا سحر اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُترتا چلا گیا ۔ پھر تقریباً اُس نے آدھا سگریٹ ایش ٹرے میں اس زور سے دبا کر بجھایا کہ ویٹر اس آواز پر چونکنا ہو کر بولا ۔

سر ! کیا چاہیئے ؟

ہاں !! کافی ——— لائٹ ——— ۔

جمیل نے ویٹر کو آرڈر دیا اور پھر ساحرہ کے متعلق سوچنے لگا ۔

سر !! کیا آپ کافی کے ساتھ کریم بھی پسند کریں گے ؟

ہاں !! لے آؤ

آرڈر لے کر ویٹر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ویٹر نے کافی میز پر لگا دی اور پاس ہی چند لمحے مؤدب کھڑا رہا۔ جب جمیل نے اسے کھڑے دیکھا تو اس سے پوچھا۔

یہ لڑکی کتنے عرصہ سے یہاں کام کر رہی ہے؟ ———

سر!! چند ماہ ہوئے مینیجر نے اس لڑکی کو کلب میں جز وقتی ملازم رکھا ہے۔

سر!! بہت اچھی ڈانسر ہے۔ خوب رقص کرتی ہے۔

اس کے انگ انگ سے یوں لگتا ہے جیسے "سحر" پھوٹ رہا ہو۔ اسی لیے تو کلب کے سب ممبر اسے ساحرہ کہتے ہیں جب وہ اسٹیج پر لہراتے ہوئے انداز میں محو رقص ہوتی ہے۔ تو کئی دل اس کے رقص کے جادو سے مسحور ہو کر بے خود ہونے لگتے ہیں۔

صاحب !! ——— ویٹر نے کسی حد تک جرأت کرتے ہوئے مزید کہا۔

ساحرہ کے جسم میں اس قدر بانکپن اور لوچ ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے یہ لڑکی پیدائشی رقاصہ ہے۔

جمیل آج جلدی گھر واپس آ گیا۔ اس کا دل کچھ بے چین سا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ رہ رہ کر اسی حسینہ کی سوچ اس کے ذہن پر آڑے ترچھے انداز میں بکھرنے لگی۔ ساحرہ کی باریک پیوستہ کمان کی طرح ابرو۔ بڑی بڑی سیاہ شوخ و بے شنگ آنکھیں

سر پر مختلف انداز میں گندھے سیاہ بال تیکھے چتون اور مرمریں ہاتھوں پر سیاہ چوڑیاں۔ جب وہ اسٹیج پر لہک لہک کر سر کا جُوڑا کھولتی تو معلوم ہوتا کہ سیاہ گھٹا نے سر سے پاؤں تک شاخِ گل کو چھپا لیا ہو۔ جب وہ چکوری رقص میں محو ہوتی تو اس کی عنبریں زُلفیں اس طرح لہراتیں جیسے چاند کے گرد ہوائیں کالے کالے ناگ لہرا رہے ہوں۔ وہ سراپا "سحرِ بنگال" ہے اور زُلف پیچاں کی طرح پیچیدہ۔

جمیل اس کے رنگیں خیالوں میں گم سا ہو گیا

آج کلب سے واپس آکر ساحرہ بھی کافی دیر تک بے جوڑ خیالات کا تانا بانا بُنتی رہی لیکن جوں جوں وہ اس اُلجھتی ہوئی صورت کو سُلجھانا چاہتی اور اُلجھتی جاتی تھی۔ کبھی وہ جمیل کے سوالوں میں ہمدردی کے رُوپ میں چھپی ہوئی محبت کو تلاش کرتی۔ کبھی اپنی زندگی کے ماضی کو جاننے کی بے کیف سی سوچ اس کو گھیر لیتی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ اسی اُدھیڑ بُن میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی ——————

پھر اس نے چاہا کہ اس گورکھ دھندے سے چھٹکارا مل جائے اس نے سامنے لگے ہوئے ایک کیلنڈر پر اپنی نگاہوں کو جما دیا۔ دیر تک اس تصویر کے خدوخال میں کھوئی رہی۔ تصویر کے نیچے ہندسے اسے زندگی کا احساس دلانے لگے اور تصویر میں کنوئیں کے اِرد گرد دوشیزاؤں کے سروں پر گھڑوں نے اُسے الھڑ مٹیار ہونے کا احساس دلایا۔ اس کے ساتھ ہی جب ساحرہ نے تصویر میں ایک خوبرو جوان کو بانسری بجاتے ہوئے دیکھا تو اس کے

ذہن کے پردے پر جمیل کی تصویر اُبھرنے لگی

جمیل کا خیال آتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی وہ چاہتی تھی کہ اس کی تصویر خیال کی طرح اس کے دل میں اُتر جائے پھر اس کے سامنے جمیل کی شخصیت ایک سوال بن کر اُبھرتی۔

ہو سکتا ہے وہ بھی ایک تماشائی ہو اور پھر رقص سے متاثر ہو کر اس نے چند رسمی جملے کہہ دیئے ہوں۔

تعریف تو سبھی کرتے ہیں۔ ساحرہ نے اپنے دل میں کہا۔

اتنے عرصہ میں کوئی اس کے دل کی گہرائی میں نہیں جھانک سکا

میری ناگن جیسی چال پر سب جان تو دیتے ہیں مگر میری روح میں بل کھاتے ہوئے خیالات کے ناگوں سے کوئی واقف نہیں۔

کاش!! ــــــــ جمیل نے کہا ہوتا ساحرہ تم کون ہو؟

تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو ــــــ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

ــــــــ! پھر ساحرہ کے دل کے ایک گوشے سے آواز اُبھری: جمیل اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن ــــــ لیکن!!

ساحرہ کی زندگی میں مرد تو بہت آئے مگر ان میں سے ہر ایک نے اس کی بجائے ــــــــ اس کے جسم کو خریدنا چاہا۔ اس کی روح کا خریدار تو کوئی نہ تھا۔ اگر جمیل بھی!! ــ ــ اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں بکھرنے لگیں۔ اس پر اُسے اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی۔

ساحرہ کو ماڈلنگ کمپنی کے مینیجر کے وہ الفاظ زہریلے بچھوؤں کی طرح ڈنک مارنے لگے ——

ساحرہ کچھ اپنے متعلق بھی سوچتا ہے ———— ؟

آخر کب تک شباب کو ڈھلتے سایوں کی طرح دیکھتی رہو گی ؟

یہ نیم برہنہ شوخیاں اور ادائیں کب تک فروخت کرتی رہو گی ——؟

اس جوانی کو اس طرح نہ گنواؤ ——— وقت کی قیمت ہوتی ہے

زندگی اور اس کے تقاضے کیا ہیں کچھ سمجھنے کی کوشش کرو ————

ناصر صاحب! اس سے آگے کچھ نہ کہیے گا۔ ساحرہ نے ماڈل کے لیے تصویر اُتروانے کے بعد کہا۔ ماڈلنگ تک آپ نے جو کچھ کہا وہ قابلِ برداشت تھا۔ لیکن اس کے بعد — میں اپنی بے عزتی محسوس کرتی ہوں اور پھر آپ کون ہوتے ہیں ———— ؟

میں اپنے متعلق آپ سے بہتر سوچ سکتی ہوں۔ !!

لیجئے! ——— ناصر نے چار سو روپے کے نوٹ ساحرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ کی ماڈلنگ کا معاوضہ !!

ناصر کے اس رویہ سے ساحرہ کو بہت دُکھ ہوا۔ لیکن وہ اس تلخی کو بھی برداشت کر گئی۔ یہ کڑوا گھونٹ بھی پی گئی۔ کہ اسے تھوڑا سا سکون تو ہوا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کی فیس تو ادا کر سکے گی۔

دوسرے دن وہ تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھی کہ کیا اس کو ماڈل گرل کی حیثیت سے کام کرنا چاہیئے تھا یا نہیں ؟ یہ سوال ہر بار اُسے

جھنجھوڑ دنیا۔ اور آخر اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی ماڈلنگ نہیں کرے گی
یہ مختلف سوچیں اس کے دامن خیال سے یوں اٹک گئیں جس طرح خار دار
جھاڑی پر شیفون کا دوپٹہ اُلجھ کر رہ جائے۔

وہ یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ اُسے ہارن کی آواز نے چونکا دیا۔

اوہو! —— کلب کا ٹائم ہو گیا ہے۔ اس نے گیٹ پر رُکتی ہوئی کار کو
دیکھ کر کہا۔

شانی!! —— تم تھوڑی دیر رکو! میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔

اچھا بیگم صاحبہ!! کلب کے مینجر کے ڈرائیور شانی نے کہا اور لان میں پڑی
ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ساحرہ نے خوشنما ساڑھی زیب تن کی بال سنوار کر جوڑے میں سفید موتیے کے
پھول سجائے اور کاسمیٹک آئی بروکی پنسل سے بھنوؤں کے رنگ کو اور گہرا کیا
اور دائیں رُخسار پر تل کی صورت سیاہ نشان لگایا۔ پھر ایوننگ ان پیرس
کی پھوار سے اپنے آپ کو عطر بیز کیا اور لباس کی مناسبت سے ڈریسنگ ٹیبل
کے پاس لٹکے ہوئے ہینڈ بیگ کو بائیں بازو پر جھولاتے ہوئے مستانہ وار
برآمدے میں سے ہوتے ہوئے کار کے پاس آئی تو شانی دوڑا ہوا آیا۔ اور
دروازہ کھول کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔

اور ساحرہ ایک شانِ بے نیازی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی کار ہوا
سے باتیں کرتے ہوئے پانچ منٹ میں کلب پہنچ گئی

ہیلو! ساحرہ!! مینجر نے ساحرہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔

آج تو آپ بہت سویٹ لگ رہی ہیں۔

یقیناً آپ قیامت سے کم نہیں ،، مینیجر بولے جا رہا تھا۔

ہاں! تو ساحرہ! آپ کو خاص بات تو بتانا بھول گیا۔

دیکھئے! ذرا خیال رہے ——————

کیا مطلب —————ساحرہ نے زور دے کر کہا۔

ساحرہ! آج اپنے کلب کے اونر بھی تشریف رکھتے ہیں۔

بڑے اچھے ہیں اور سمارٹ بھی —— چند روز ہوئے امریکہ سے آئے ہیں۔

ساحرہ نے ہال میں داخل ہوتے ہی متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر جمیل کو دیکھا جمیل ایک کونے کی میز پر بیٹھا سگریٹ کے بھرپور کش سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑ کر ان کے دائروں میں کسی کی تصویر بنا رہا تھا۔

اُسے دیکھ کر ساحرہ کی آنکھوں میں محبت کی چمک پیدا ہو گئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسی کی طرف بڑھی ۔ ۔ ۔ قریب جا کر کہا میں آپ کے پاس چند منٹ کے لیے بیٹھ سکتی ہوں ؟

جمیل نے نگاہیں اُوپر اٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

کیا میں ——————

ہاں !! ———— ہاں !! کیوں نہیں !!!

میں تو کافی دیر سے منتظر ہوں ۔

وہ کیوں ؟ ساحرہ نے چھیڑتے ہوئے کہا ۔

بس ایسے ہی دل نے چاہا کہ آپ سے کچھ باتیں کروں گا۔

ساحرہ!!

کیا آپ اکیلی ہیں؟

نہیں تو ــــــ میرا ایک بھائی ہے جو زیرِ تعلیم ہے کہنے کو والدین بھی ہیں۔ شاید انہیں بھی معلوم نہ ہو کہ میں کون ہوں تقسیم ملک کے وقت انہوں نے مجھے گود لے لیا تھا۔

ساحرہ تو آپ کو لوگ کہتے ہیں ــــــ مگر آپکا اصل نام کیا ہے ــــــ

اصل نام اس پر ساحرہ کچھ چونک سی گئی۔

جمیل صاحب!!

میں ساحرہ ہوں اور صرف ساحرہ ــــــــــــ

"وہ تو ظاہر ہے اس میں شک کیا ہے" جمیل نے کہا۔

اب ساحرہ کو دھچکا سا لگا۔ نام تو اسے بھی پتہ نہیں تھا۔

بس جب شعور کے کان میں آواز آئی تو وہ آواز ساحرہ کی ہی تھی ــــــ

اسی نام سے لوگ بھی اسے جانتے ہیں

"کیا میرا نام آپ کو اچھا نہیں لگتا"۔ ساحرہ نے آنکھیں جھکاتے ہوئے کہا۔

نہیں ایسی تو بات نہیں ــــــ ساحرہ بہت اچھا نام ہے۔

اور ساحرہ خود بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔

جمیل نے جب یہ کہا تو ساحرہ کے جسم میں ایک لطیف جھرجھری سی ہوئی۔

سچ! "میں آپ کو اچھی لگتی ہوں"۔ ساحرہ نے جمیل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ہاں! ساحرہ!

اچھا اب تو تمھارے رقص کا وقت بھی قریب ہے۔
رقص کے بعد باتیں ہوں گی۔
آپ رہتی کہاں ہیں۔ جمیل نے پوچھا۔
"کاشانہ عشرت" ساحرہ نے مختصر سا جواب دیا۔
"اچھا!" یہ کہہ کر ساحرہ اپنے کمرہ خاص میں چلی گئی۔
جمیل اس کے جانے کے بعد خوشی سے مسرور اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔
ساحرہ کچھ بھی ہو — کوئی بھی ہو۔ میں اُسے ضرور اپناؤں گا۔
میں اس کے دُکھ بانٹوں گا۔
ہاف سیٹ چائے ——— جمیل نے پاس سے گزرتے ہوئے ویٹر کو کہا۔
یس سر! —— ابھی حاضر ہوا۔
جمیل نے چائے بنا کر پیالی۔ اپنے ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ آرکسٹرا کی دھن نے اُسے چونکا دیا۔ ———
اور پھر چند لمحے بعد ساحرہ اسٹیج پر نمودار ہوئی۔
جمیل نے دیکھا ساحرہ آج پہلے سے بہت خوش تھی۔ اور اس کے چہرے پر سکوں کی گہری لہریں پھیلی ہوئی تھیں۔
رقص کرتے ہوئے لہک لہک کر وہ یوں جھوم رہی تھی۔ جیسے کوئی مُنہ زناگن بل کھاتی ہو۔ رقص کے دوران کئی بار وہ جمیل کے سامنے کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول ڈول گئی۔

رقص ختم ہوا تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔

خوب! ـــــ کیا بات ہے ـــــ قاتل ہے ـــــ قیامت ہے ـــــ ساحرہ جو ہوئی ـــــ جادو کر ڈالتی ہے ـــــ ان آوازوں میں سے گزرتی ہوئی ساحرہ جمیل کے پاس جانا چاہتی تھی کہ ـــــ

ـــــ ساحرہ! منیجر کی آواز نے اُسے روک لیا۔

کیا حکم ہے؟ ـــــ ساحرہ نے کہا۔

ساحرہ تمھارا رقص شہزاد خاں نے بہت پسند کیا ہے۔

کون شہزاد خاں ۔ ساحرہ نے تعجب سے پوچھا۔

کلب کے سب سے بڑے ممبر۔ جو شہر کے بڑے دولت مندوں میں بھی شمار ہوتے ہیں وہ جو سامنے والے صوفہ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ساحرہ نے مڑ کر دیکھا تو صوفہ پر کوئی نہ تھا اس نے منیجر کی طرف دیکھا۔

ہاں تو وہ اپنے کمرے میں گئے ہیں اور ـــــ اور تمہیں بھی یاد کیا ہے۔

ساحرہ! یہ لفافہ تمہارے نام ہے ـــــ منیجر نے لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

ساحرہ نے لفافہ کو کھولا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے کلب کی تمام دیواریں دھڑام سے گر گئی ہوں۔

اس کے ہاتھ سے لفافہ نیچے گرا۔ جمیل نے ساحرہ کے ہاتھ سے گرتے ہوئے دونوں کاغذ اُٹھا کر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ایک کاغذ پر دعوت اور دوسرا بینک چیک تھا۔

جس پر ساحرہ جتنی رقم چاہیے لکھ کر اپنے کندن جیسے جسم کی قیمت لگا کر حاصل کرے۔ ابھی جمیل سوچ ہی رہا تھا کہ ساحرہ نے دونوں کاغذ جمیل کے ہاتھ سے بجلی کی تیزی کے ساتھ لے کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اور پاؤں کے نیچے ڈال کر مسل دیا۔

اور جمیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کلب سے باہر آگئی۔

"خراشیں"

نادرہ کو مرے ابھی صرف چھ ماہ گزرے تھے کہ اجمل کے گھر کا نقشہ بدلنے لگا۔ نادرہ کی بے وقت موت اجمل کی زندگی کا ناسور بنتی جا رہی تھی۔ وہ ایک چلتی پھرتی لاش بن گیا۔ وہ زندہ ضرور تھا لیکن اس کی زندگی میں زندگی کا نام تک نہ تھا۔ تنہائی کا گراں بوجھ اس کے کندھوں پر یوں گرا جیسے ساون کی مسلسل بارش سے کوئی بوسیدہ مکان اپنی چھت سمیت اپنے مکیں پر آ گرے۔ اَب تو اجمل اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ باتیں جن کا نہ سَر نہ پیر۔۔۔۔۔۔ بڑھی ہوئی شیو۔۔۔۔۔ بوجھل بوجھل قدموں سے نڈھال جسم و جان کو اٹھائے اپنے مکان کے سامنے لان میں گھنٹوں گھومتا رہتا۔ کبھی کبھی ہاتھ کی اُنگلیاں مروڑ ڈالتا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا خیال آتا کہ چند لمحوں کے لیے وہ اطمینان کا سانس لے کر گھاس پر بیٹھ جاتا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ تھا۔لیکن اس کے باوجود جو چیز اجمل کو عزیز تھی یا جس کا اس کو ہمیشہ خیال رہتا وہ تھی فوزیہ ۔۔۔۔۔اجمل کی جان ۔۔۔ اس کی زندگی ۔۔۔۔۔ اس کا پیار ۔۔ ایک یاد ۔۔۔ ایک تلخ و شیریں ماضی ۔۔۔۔۔ نادرہ کی چاہت ۔۔۔ اور اس کی محبت کا مجسّمہ۔

اسی خیال میں ڈوبے وہ اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے ننھی فوزیہ کے کمرے میں گیا۔ فوزیہ سو رہی تھی۔اجمل نے بڑھ کر فوزیہ کی پیشانی کو چوم لیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر فوزیہ کے رُخساروں پر پھیل گئے۔لیکن معصوم آنکھیں میٹھی نیند کی لوری سُنتے سُنتے پھر سے سو گئیں۔

اجمل دبے پاؤں اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔میز پر پڑی ہوئی کتاب اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔شروع میں اُسے کچھ اکتاہٹ سی محسوس ہوئی بعد میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔وہ پڑھتے پڑھتے کچھ دیر کے لیے رُک کر گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

کتاب کا تیسرا باب اس کے سامنے کُھلا تھا۔ وہ پڑھتے ہوئے سو گیا۔ دھوپ چھاؤں میں ۔۔۔ روشنی اندھیرے میں۔ صبح شام اور دن رات میں بدلنے لگا۔اجمل کے ذہن پر تصویریں بنتی رہیں مٹتی رہیں۔ ایک سوچ کی ندی دُور دُور تک بہنے لگی وہ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے سگریٹ پیتا رہا۔اور مرغولے بناتا رہا۔ اسی ادھیڑبن میں ایک تصویر اُبھری۔

وہ ہوٹل کی دوسری منزل میں بیٹھا ہوا ہے۔منظر بڑا سہانا ہے۔یہ برف پوش وادی ۔۔۔ سرد ہوا ۔۔۔ ہلکی ہلکی بارش۔اُونچے اُونچے درخت

برف سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ سڑک پر باوجود سردی اور برف کے بڑی چہل پہل تھی۔ وہ ابھی کچھ سوچ رہا تھا کہ پاس والی میز پر نوجوان لڑکوں کی کھسر پھسر نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اُس نے لاپروائی سے ان کی باتوں کی طرف دھیان دیا۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

ابے وہ دیکھو!! میں نہ کہتا تھا..... وہ ضرور آئے گی۔ وہ بات کی بہت پکّی ہے۔ بڑی خوبصورت ہے ۔۔۔ اور ماڈرن بھی خوب ہے ۔۔۔ وہ زندگی کو صرف ایک کھیل سمجھتی ہے ۔۔۔ اور پھر زندگی ہے بھی تو یہی کچھ۔ .... بڑی آزاد خیال ہے۔ وہ بے جا پابندیوں کی قائل نہیں اور ۔۔۔ اور!!

تم تو سب جانتے ہو کہ لڑکی ۔۔۔ امیر زادی ہو۔ ۔۔ آزاد خیال ہو۔ .... تو پھر کیا کچھ ممکن نہیں؟ میرا خیال ہے یہ دوسری لڑکی جو اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھی بس ایسی ہی ہے .... چلو تمہارا بھی وقت اچھا کٹ جائے گا۔ لو!! وہ دوکان کی طرف چل دیں۔ اُڈا اپنی آنکھ سے دیکھ لو۔ کس قدر حسین ہے؟

اجمل نے دوبارہ دیکھا تو وہ دونوں لڑکے سڑک پر آ گئے تھے۔ وہ لڑکیاں دوکان پر چڑھنے لگیں تو اجمل نے دائیں ہاتھ والی لڑکی کے چہرے کو دیکھا تو اس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کلبلا اُٹھا ۔۔۔ تم!! فوزیہ یہ تم ہو ۔۔۔ میں یہ کیا کچھ دیکھ رہا ہوں؟ اس قدر بے حیائی نہیں نہیں یہ کوئی اور ہے ۔۔۔ دنیا میں ہم شکل بھی تو ہوتے ہیں فوزیہ ایسی نہیں ہو سکتی۔

آج پھر وہ بڑا اداس تھا ۔۔۔ وہ گھنٹوں اِدھر اُدھر گھومتا رہا لیکن کہیں بھی اس کا دل نہ لگا۔ اس نے چاہا کہ آج وہ شہر کے سب سے اعلیٰ اور فیشن ایبل

ہوٹل میں جائے گا۔ شاید وہاں دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ وہ ہوٹل میں داخل ہو کر ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ارد گرد بڑی رونق تھی۔ وہ کافی کے تلخ تلخ گھونٹ بھرنے لگا وہ اس تلخی میں اپنی زندگی کی تلخی گھول دینا چاہتا تھا۔ چند منٹ بعد ہال خوبصورت جوڑوں سے بھر گیا۔

آج ہوٹل میں "پنجاب دیس" پروگرام تھا جس میں پنجاب کے روائتی ناچ گانے پیش کیے جانے تھے۔ سب لوگ منتظر تھے کہ اتنے میں ایک "لوک گیت" سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ سب لوگ جھوم اُٹھے۔ اس کے بعد ایک شوقیہ رقاصہ کو دعوت رقص دی گئی پردہ اٹھا ایک نیم برہنہ دوشیزہ اسٹیج پر نمودار ہوئی وہ حسن کی مجسم صورت تھی۔ رنگ برنگ روشنیاں اس کی خوبصورتی اور بدن کے خدوخال اور مختلف زاویوں کو اُبھارنے لگیں۔ آرکسٹرا کا سینہ دھڑکنے لگا۔ اس کی مرمریں باہیں اور پاؤں تھرکنے لگے۔ اجمل نے کافی کا آخری گھونٹ لیا۔ اور دلربا حسینہ کا ناچ دیکھنے کے لیے ہمہ تن چشم بن گیا تو دیکھتے ہی دیکھتے رہ گیا۔ دل میں چیخ اُٹھا۔ ۔ ۔ روشنیاں گل کر دو۔ ۔ ۔ یہ روشنیاں میری آنکھوں کو اندھا کر دیں گی ۔ ۔ ۔ اچھا ہے میں اندھا ہو جاؤں اور تاریکی میرا نصیب ہو۔ وہ ایک بار پھر چلّا اُٹھا۔ ۔ ۔ "مجھے روشنی نہیں چاہیے۔ روشنی نہیں چاہئے! روشنی!! میرے ضمیر کی موت ہے اس نے گلہ کرتے ہوئے انداز میں کہا فوزیہ!! تم پھر میرے سامنے آ گئی ہو ..... مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔ بے شرم ..... تمہیں اس سے پہلے موت کیوں نہ آ گئی...؟

ڈیڈی !! ڈیڈی !!

میں فوزیہ ہوں آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ ناچ گانا تو تہذیب کی جان ہے..... ثقافت ہے..... زندگی ہے خوشیوں کا نام ہے۔ ڈیڈی ناچنا اور گانا زندہ رہنے کے لئے بہت ضروری ہے اور پھر ساتھی کے انتخاب میں بھی آسانی ہو جاتی ہے۔ ڈیڈی!! کچھ سمجھا تو کریں۔ آپ کیسے دقیانوسی ہیں؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے؟ اور آپ لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ زمانے کے ساتھ جینا سیکھئے ڈیڈی!! میں کوئی حلوہ تو نہیں جسے لوگ کھا جائیں گے۔ یہ تو آج کا چلن ہے۔ ڈیڈی ٹی وی اور فلم میں کام کرنا تو فیشن ہے۔ ماڈل گرل بننا اور بوائز فرینڈز رکھنا تو اونچی سوسائٹی کے لیے ضروری ہے۔ یہی عورت کی قسمت بڑھاتی ہے۔ خدا کے لیے آپ پرانے خیالات کے دھندلکوں کے پیچھے نہ دوڑیئے! آپ میری خوشیاں کیوں چھیننا چاہتے ہیں۔ بند کرو!! یہ بکواس بند کرو!! اپنی بکواس اس کی آواز ڈوبتے ہوئے ابھری "فوزیہ!! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو کلنک کا ٹیکہ ہے۔ تو نے خاندان کی ناموس کو بٹہ لگایا ہے۔ میں نے تجھے اس دن کے لیے تو نہیں پالا تھا..... وہ ناز و نعم..... تعلیم و تربیت..... یہ رقص..... یہ آزادی..... اور یہ ننگا پن۔ خدایا!! مجھ سے میری عقل و فہم چھین لے..... میری آنکھیں پھوڑ دے۔ فوزیہ تو نے میری عزت کو خاک میں ملا دیا ہے لیکن یاد رکھ۔ آج رات تیری زندگی کی آخری رات ہوگی۔

اجمل بڑبڑا کر پھر سو گیا۔

شہر کی سب سے خوبصورت سڑک ہے وہ ایک کنارے پر رُک کر کچھ سوچ رہا تھا۔ اس نے دیکھا ایک آدمی قریب آکر رُک گیا اور رُکتے ہوئے سگریٹ کا کش لے کر اس نے چٹکی بجائی اور بڑھ کر گویا ہوا کچھ چاہیئے تھا جی۔۔۔۔ بڑی کلاس لونڈیا ہے۔ کوئی ایسی ویسی نہیں۔۔۔ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔۔۔ عمر بھی کوئی اٹھارہ سال۔۔۔ رئیس زادی ہے اور ہاں!! بس شوق کی خاطر۔۔۔ دھندا نہیں آپ فرمائیں تو۔۔۔ اجملؔ سُنتا رہا وہ کہہ رہا تھا۔ ہیں تو وہ اپنے پاس ہی سے کچھ نہ کچھ دے دیتی ہے۔ شکار سے وہ خود بھی کچھ نہیں لیتی۔۔۔۔ اُلٹا خدمت ہی کرتی ہے۔ نہ جانے کیسی لڑکی ہے۔ اپنی نوعیت کی آپ۔۔۔ فوزیہؔ تم بھی عجیب ہو! تمہارا یہ نرالا کھیل اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر تم جانو۔۔۔۔ تمھارا کام ہمیں تو صرف دام سے غرض ہے۔

فوزیہ کا نام سُنتے ہی اجملؔ پر بجلی گری۔ جوش سے اُٹھا ہاتھ پھیلا کر ایک بار اُس نے اپنے دانتوں سے نچلے ہونٹ کو چبا ڈالا۔

دروازے کو کھول کر فوزیہ کے کمرے میں گیا۔۔۔ اس کا سایہ سوئی ہوئی فوزیہ پر پڑا۔ لاشعوری طور پر دونوں ہاتھ اس کے گلے پر رکھ دیئے۔ وہ اس مستقبل کے مجسم خدشے کو ایک ہی وار میں ختم کر دینا چاہتا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر رُکا۔۔۔۔۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔۔۔ صُبح کا نور پھیل چکا تھا۔۔۔ تاریکی چھٹ گئی تھی۔

اجمل نے اپنے ہاتھ ننھی فوزیہ کے گلے سے ہٹا کر اپنے دانتوں سے چبا ڈالے۔ چند خون کے قطرے سفید چادر پر گر کر جذب ہو گئے اس کے خدشے جوان ہو کر موت کی نیند سو چکے تھے۔ اس نے بڑھ کر بچی کو اُٹھا لیا اور سینے سے یوں لگا لیا جیسے سُورج کی پہلی روشن کرنوں نے صبح کو فوزیہ میں بھول گیا تھا۔ روشنی !!

پھر بھی روشنی ہے !!

خالوجان

اُن کا نام کیا تھا اس سے تو شاید کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ہر چھوٹا بڑا انہیں بس خالوجان ہی کہا کرتا تھا۔ بڑے جامہ زیب آدمی تھے سُرخ و سپید رنگ، جُھریوں سے پاک چہرہ۔ نشتری مونچھیں، کوتری ڈاڑھی روشن آنکھیں یوں لگتا تھا جیسے خالوجان چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ مگر جب وہ تحریک خلافت اور تحریک آزادی میں اپنی پُرشباب جوانی کے ولولہ انگیز واقعات سُنانے بیٹھتے تو ذہن یہ تسلیم نہ کرتا کہ خالوجان ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں ہیں۔ سُنا ہے ساٹھ سال کی عمر میں اِنسان سٹھیا جاتا ہے مگر ان کی اس عمر میں بھی خداداد صلاحیتوں کا ہر کوئی معترف تھا تاریخ، فلسفہ اور سائنس کے علاوہ اردو، انگریزی ادب پر بھی انہیں عبور تھا۔

دوران گفتگو ضرب الامثال، تلمیحات اور اساتذہ کے اشعار اس طرح پیش کرتے جیسے وہ ہاتھ باندھے چلے آرہے ہوں۔ اسکولوں، کالجوں کے طلباو طالبات کے لیے مذاکروں کے مضمون لکھتے، مباحثوں کی تقاریر تیار کرتے اور مشاعروں کی غزلیں کہتے۔ بس ہر ایک کو ادیب بنانے کی دُھن جنون کی حد تک تھی۔ ہر شخص کے دُکھ درد میں اس طرح شریک رہتے جیسے وہ ان کا اپنا دکھ ہے۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو تڑپ جاتے اور جب تک وہ خوشی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرانہ لیتا اُنہیں چین نہ آتا۔ محلے میں ان کی حیثیت ایک روشنی کے مینار کی سی تھی۔

تحصیلدار خان وجاہت خان کی لڑکی عنبریں بی اے کی طالبہ ہوتے ہوئے بھی پُرانے معاشرے کی دل دادہ تھی۔ پُورا خاندان ہی قدامت پرست تھا۔ اسی لیے وہ کسی ایسے قابل اُستاد کی تلاش میں تھے جو نہ صرف شریف ہو بلکہ عمر رسیدہ بھی ہو اور تدریس کا وسیع تجربہ بھی رکھتا ہو۔ آخر ان کی نظرِ انتخاب خالو جان پر پڑی۔ خاں صاحب ان سے ملے۔ رسمی گفتگو کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔ تو خالو جان گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد خاں صاحب نے کہا۔ "میں بڑے اعتماد کے ساتھ آپ کے پاس آیا ہوں۔ خدارا! میرے اعتماد کو ــــ ٹھیس نہ پہنچائیے گا۔ جہاں تک معاوضہ کا تعلق ہے۔ وہ آپ ــــ جو ــــ بھی فرمائیں گے پیش کر دیا جائے گا۔" ــــ خیر ــــ! معاوضہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ــــ میں آپ کی خواہش کا احترام کرتا ہوں۔ خالو جان نے متانت سے جواب دیا۔ سوچ رہا

ہوں کہ شام کو غریب لوگوں کے چند بچے پڑھنے آتے ہیں۔ اگر شام کا وقت آپ کو دے دیا تو ان بچوں کے والدین میں اتنی سکت نہیں جو فیس دے کر پڑھ سکیں"۔

خانصاحب مسکراتے ہوئے بولے میں تو ڈر رہا تھا کہیں آپ میری خواہش کو ٹھکرا نہ دیں۔ مگر یہ تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے آپ سوچ رہے ہیں بچے چاہے امیر کے ہوں یا غریب کے قوم کا سرمایہ ہیں۔ ان کے دل و دماغ کو علم کے نور سے منور کرنا قوم کی خدمت ہے اور ہر پاکستانی کا یہ فرض ہے۔ آپ انہیں شوق سے پڑھایئے۔ مگر ہمارا بھی تو حق ہے ان سے فارغ ہو کر بھی آپ تشریف لا سکتے ہیں"۔ "درست فرمایا آپ نے خالو جان نے اُٹھتے ہوئے کہا کل سے بسم اللہ کروں گا مگر صاحبزادی سے کہہ دیجئے۔ وہ ناغہ نہیں کریں گی۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آج فلاں عزیز سہیلی آئی ہیں کل فلاں سہیلی کی سالگرہ ہے۔ کبھی میزبانی میں لگی ہیں کبھی مہمانی میں عزیزوں کے ہاں جا رہی ہیں۔ یہ پابندی اگر منظور ہو تو میں حاضر ہوں"۔۔۔۔ خانصاحب بے ساختہ ہنس دیئے۔

"یہ چونچلے ہوتے تو ہیں مگر ہم تو انہی راہوں پر چلے جا رہے ہیں جن پر ہمارے بزرگ چلتے رہے ہیں"۔

بہت خوب! خالو جان نے ان کے نظریات کو سراہتے ہوئے کہا۔ پھر تو صاحبزادی کو پڑھانے میں خوشی محسوس کروں گا۔

دوسرے دن جب خالو جان بچوں کو پڑھا کر فارغ ہوئے تو تاریکی پھی

ہلکی سی چادر پھیلا چکی تھی سڑکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں کہ خالو جان نے خانصاحب کے دروازہ پر دستک دی۔ دوسرے لمحے خانصاحب ان کے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ آئیے قبلہ! تشریف لائیے! خانصاحب انہیں لےکر ڈرائینگ رُوم میں آئے اور بٹھاتے ہوئے بولے۔ عنبرین کو آپ کی لگائی ہوئی پابندیاں منظور ہیں، وہ ابھی آتی ہے۔ چند لمحے گزرے تھے کہ پیروں کی چاپ سُنائی دی۔ خالو جان نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک نازک سی لڑکی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

آداب!

جیو بیٹی! خالو جان نے مشرقی تہذیب کے شاہکار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اور —— ان کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ خالو جان کے حافظہ میں کئی چہرے ایک ساتھ اُبھرے — انہوں نے کئی بار اپنی آنکھیں جھپکائیں اور پھر ایک چہرہ واضح ہوتا چلا گیا۔

ش —— ا —— ک —— ر —— ہ ——! کھڑی کیوں ہو؟ بھئی —— بیٹھو! بیٹھو! خالو جان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

جی! شکریہ ——! وہ چھوئی موئی کی طرح مسکرا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

اچھا تو —— تم —— شاکرہ ہو؟ خالو جان نے بات کا سلسلہ چھیڑا۔

جی —— نہیں جناب! عنبرین ——! شاخِ گل نے لجاتے ہوئے کہا۔

ہاں —— ہاں!! عنبرین تم کس مضمون میں کمزور ہو —؟

فلسفہ اور انگریزی میں جناب! عنبرین نے مختصر سا جواب دیا۔

خالو جان نے فلسفہ کی کتاب اُلٹتے پلٹتے ہوئے پُوچھا کیا تمہیں معلوم ہے۔ زلزلے کیوں آتے ہیں۔

زلزلے یہ تو اوّلیٰ جماعت کا سوال ہے اور پھر اس کا فلسفے اور انگریزی سے کیا تعلق۔ عنبرین نے ایک ہی سانس میں پوچھ لیا۔

تم ٹھیک کہتی ہو اور ہاں یہ جناب جناب کا سلسلہ ختم ہونا چاہیئے خالو جان نے گڑبڑا کر عنبرین سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

اچھا ــــ اس سوال کو چھوڑو مگر اس سے تو تم بھی اتفاق کرو گی کہ زلزلے سے بڑی تباہی ہوتی ہے۔ جہاں یہ "قیامت صُغریٰ" برپا ہو۔ وہاں اس کی جاہی اور بربادی تو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مُسکراتے ہوئے پھُول سے چہرے منوں مٹی کے نیچے دب جاتے ہیں خالو جان نے خلاؤں میں گھُورتے ہوئے کہا۔

درُست فرمایا آپ نے عنبرین نے بھی تائید کی۔

موت بھی کیا چیز ہے؟ انسان مر جاتا ہے مگر اپنی یادوں کے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ ایسے نہ معلوم کتنے لوگ ہوں گے جن کے عزیز اور پیارے حادثوں کا عنوان بن گئے اور وہ زندگی بھر کے لیے کرب میں مُبتلا ہو گئے۔ خالو جان عنبرین کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے۔

ایسے لوگ بڑے قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ عنبرین نے افسردہ لہجے میں ہمدردی کا اظہار کیا۔ "یہ موضوع کیسا ہے؟ جتنا پھیلاؤ پھیلتا جائے گا۔ فلسفہ سے موت وحیات کی گھتیاں نہیں سُلجھائی جا سکتیں۔ کائنات کی جُستجو کرنے والے ابھی اس

کا سراغ نہیں لگا سکے جس روز اس راز سے پردہ اُٹھ گیا۔ انسان زندگی پر فتح پالے گا۔ خالو جان نے کہا۔ عنبرین سر جھکائے خالو جان کی باتیں سُنتی رہی اور دل ہی دل میں ان کے علم کی اور طریقہ تدریس کی داد دیتی رہی وہ تو آج تک کتابیں چاٹتی رہی تھی تعلیم تو اب شروع ہوئی تھی ۔

درس کا سلسلہ چلتا رہا عنبرین کے پاس مختلف موضوعات پر معلومات کا ذخیرہ جمع ہوتا گیا۔ خالو جان کبھی میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور داغ کی عشقیہ اور نیچرل شاعری کے بارے میں بتاتے کبھی اکبر الہ آبادی کی ظرافت، حالیؔ کے مسدس اور اقبال کے فکر اور فلسفہ خودی سے آگاہ کرتے کبھی انگریزی ادب میں گوئٹے اور شیلے کی رُومانی شاعری پر روشنی ڈالتے کبھی ورڈز ورتھ کی فطرت نگاری اور شیکسپیئر کے ڈرامہ پر بہت کچھ کہتے۔ قدیم اور جدید فلسفہ کا تقابلی نقشہ پیش کر کے نئی نئی راہیں دکھاتے۔ خالو جان باقاعدہ پڑھانے آتے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ۔ پڑھاتے پڑھاتے عنبرین کی کلیوں جیسی کومل مسکراہٹ کی خوشبو میں کھو جاتے۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے صاف چہرہ پر تغیر و کرب کی لکیریں پھیل جاتیں مگر وہ اپنے ذہنی اضطراب کو دبا دیتے کچھ دنوں سے عنبرین بھی یہ محسوس کرنے لگی تھی لیکن اس بارے میں کچھ پُوچھنے کی ہمت نہ پاتی ۔

ادھر خالو جان جب گھر لوٹتے تو عنبرین کو اپنے ذہن میں شدت سے رینگتے پاتے۔ پھولوں کی طرح نکھری نکھری سی عنبرین جس کے چہرے پر حور دل سا تقدس ہوتا جس کی مسکراہٹوں میں بھینی بھینی خوشبو رچی ہوتی۔ عنبرین کو پاکر

خالو جان نے یوں محسوس کیا جیسے ان کے ذہن کی ساری تاریکیاں چھٹ گئی ہوں ـــ اور ـــ دھنک کی خوشنما رنگ برنگی دھاریاں فضا میں بکھر گئی ہوں۔

عنبرین جب تک پڑھتی رہتی وہ یوں محسوس کرتے جیسے ان کے اردگرد فضائیں گنگنا رہی ہوں۔ ہارسنگھار کے پھول موسم بہار کا سندیسہ دے رہے ہوں۔

اسی دوران عنبرین کی ایک اور سہیلی نزہت بھی سبق میں شریک ہونے لگی۔ عنبرین کے مقابلہ میں بہت ذہین تھی۔ ہر بات کی تہہ تک بہت جلد پہنچ جاتی۔ خالو جان پڑھاتے اور وہ خالو جان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو پڑھتی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے محسوس کیا کہ خالو جان عنبرین میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس احساس نے اُسے پریشان کر دیا۔ اس کا ذہن طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کے دل میں خالو جان کا بڑا احترام تھا۔ وہ اس عظیم رشتے کی بڑی قدر کرتی تھی جو ایک اُستاد اور شاگرد کے درمیان ہوتا ہے۔ آخر ایک دن اس نے اپنی ذہنی بے چینی کا ذکر خالو جان سے کر ہی دیا۔

پہلے تو خالو جان جواب دینے سے کتراتے رہے تھے۔ مگر خاموشی دوسرے معنیٰ بھی پہنا سکتی تھی۔ یہی سوچ کر خالو جان کہنے لگے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پچیس سال کا تھا۔ انہوں نے خلاؤں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ شادی ہو چکی تھی۔ دن خوشی و مسرت میں گزر رہے تھے۔ کہ اچانک دوسری جنگ عظیم کا دھماکہ ہوا۔

میں ملازمت کے سلسلہ میں باہر چلا گیا۔ تنہا تھا۔ صبح کا ناشتہ خود تیار کرتا۔ دوپہر اور رات کا کھانا ہوٹل میں کھاتا۔ دن پُر سکون گزر رہے تھے۔ بھائی بہن تو تھا نہیں جن کی محبت پریشان کرتی۔ نو بیاہتا بیوی ضرور یاد آتی تھی۔ مگر فرض کے سامنے اس کا پیکر بھی ماند پڑ جاتا۔

سامنے ایک پنڈت جی رہتے تھے۔ نہایت شریف انسان۔ ہر ایک کا درد دُکھ بٹاتے۔ شام کو اکثر آجاتے۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے میرا دل بہلاتے۔ ایک روز وہ نہ آئے میں نے ہی دروازہ پر جا کر پکارا — تو انہوں نے گھر میں بلالیا۔ دیکھا کمبل اوڑھے پلنگ پر دراز ہیں۔ پوچھا پنڈت جی یہ کیا۔؟ بخار ہے بھائی! پنڈت جی نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ کب سے؟ صبح اٹھا تو سر بھاری تھا کام میں لگا رہا۔ آخر جب مجبور ہو گیا تو تھک کر لیٹ گیا۔

اتنے میں ایک کامنی سی لڑکی چائے کی ٹرے اُٹھائے آگئی۔ یہ میری لڑکی پرکاش ہے۔ پنڈت جی نے بتایا۔ پرکاش — علم کی مظہر اور لاجونتی کی ٹہنی لڑکی — پنڈت جی کی لڑکی — میری سوچ میں کئی سوال کلبلائے۔ کس خیال میں ڈوب گئے! پنڈت جی نے چونکا دیا۔ کچھ نہیں — میں سوچ رہا تھا ایسی پیاری سی میری بھی کوئی بہن ہوتی — یہ بھی تمہاری بہن ہے۔ پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ میری اکلوتی بیٹی ہے۔ اسے بھی بھائی کی تمنا ہے — کبھی تو اس کی یہ خواہش دیوانگی کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کیا تم اسے بھائی کا پیار دے سکو گے؟ پنڈت جی نے بڑی حسرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر پنڈت جی! — میں تو مسلمان ہوں — میں جانتا ہوں بیٹا! میں انسانیت

کا قائل ہوں ـــــ اچھا انسان کسی قوم، کسی مذہب کا ہو۔ اچھا ہے۔ یہ ساری مخلوق ایشور کی میلا ہے۔ بھگوان ان کی مایہ ہے۔ یہ میں اور تُو کے جھگڑے سب بناوٹی ہیں۔ کھوکھلے ہیں ان سے انسانیت کی تحقیر و تذلیل ہوتی ہے۔ پنڈت جی بولے جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اسلام بھی تو یہی کہتا ہے۔ میرے ذہن سے رنگ و نسل اور مذہبی منافرت کے پردے اُٹھتے جا رہے تھے۔

میرے لیے یہ باعثِ فخر ہے۔ آج سے یہ میری بہن ہے ـــ میں نے پنڈت جی سے کہا ـــ پنڈت جی اُٹھ بیٹھے جیسے اب وہ بیمار ہی نہیں ہیں۔ پرکاش کو میرے قریب بیٹھنے کا حکم دیا۔ پھر جیب سے قلم تراش نکالا۔ اور میری انگشتِ شہادت پر زخم لگا کر خون کی ایک بُوند لی اور کہا یہ پرکاش کے ماتھے پر لگا دو۔ میں نے ایک معمول کی طرح عامل کے حکم کی تعمیل کی۔ لو بِٹیا! تمھارے ماتھے پر بھائی نے اپنے خون کی بندی لگا کر ایک وعدہ کر لیا۔ تمھیں بہن بنا کر تمھاری عزت کے لیے خون دینے کا عہد باندھ لیا ہے۔ اب تم بھی "رکھشا بندھن" بھائی کے ہاتھ پر باندھ دو۔ پنڈت جی نے پرکاش کو کہا۔

پرکاش رنگ برنگی ڈوری میں ریشمی پھولوں کی مالا اُٹھا لائی۔ پھر میری دائیں کلائی پر باندھ کر ایک لڈّو میرے مُنہ میں ٹھونس دیا۔ اور دوپٹہ کا پلّو پھیلا کر بولی۔ بہن کو <u>رینگ</u> دو بھیّا! ـــ دس روپے میں نے اس کے پلّے میں ڈال دیئے۔ پنڈت جی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ ایسا دلی سکون محسوس کر رہے ہیں جیسے بیان کرنے کے لیے اُن کے

پاس موزوں الفاظ نہیں ــــ

دن گزرتے گئے۔ میں پرکاش کو شاکرہ کہتا وہ کہتی میں تو پرکاش ہوں
بھیا! "پرکاش اور شاکرہ میں فرق حرف ہ کا ہے۔ پرکاش" ــــ میں جواب
دیتا ــــ کیسے؟ ــــ میں بھی تو جانوں وہ کہتی پرکاش کو الٹ کر پڑھو اور
پ کو ہ سے بدل دو۔ آہا!! پ۔ ر۔ ک۔ ا۔ ش الٹ کر بنا۔
ش۔ ا۔ ک۔ ر۔ پ اور ہ۔ پ کی جگہ لگا دی۔ واقعی یہ تو شاکرہ بن گیا۔
ــــ پرکاش خوش ہو کر آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

وقت کی دھوپ چھاؤں سے بدل گئی میں محاذ پر بھیج دیا گیا۔ ملک
تقسیم ہوا۔ دنیا اُلٹ پلٹ گئی۔ ادھر کی دنیا اُدھر ہو گئی۔ اس انقلاب
میں شاکرہ اور اس کے گھر والے نہ معلوم کہاں چلے گئے ان کا کیا انجام ہوا؟
میں پھرتا پھراتا یہاں آ بسا۔ ادھر خانصاحب نے عنبرین کی تعلیم میرے
سپرد کر دی۔ پہلے دن جب میں نے اُسے دیکھا تو شاکرہ تھی۔ میں تناسخ
کا قائل نہیں ہوں ــــ اور ــــ ایک مسلمان اسے کیسے تسلیم کر سکتا ہے
اس کا ایمان تو روز حساب پر ہے۔ وہ تو قیامت پر یقین رکھتا ہے ــــ
اب میں خلاؤں میں گھورتا ہوں۔ اور شاکرہ کی تلاش کرتا ہوں مگر نہیں ــــ
وہ تو ہر وقت میرے سامنے ہوتی ہے اب میں اس عمر میں ہوں کہ اسے
بہن بھی نہیں کہہ سکتا۔ کاش! ــــ اے کاش آج وہ زندہ ہوتی خالو جان
کہے جا رہے تھے چہرے پر اداسی آنکھوں میں نمی ــــ پلکیں بھیگ گئی
تھیں۔

آپ عنبرین کو بیٹی بنا لیجئے! نزہت نے تجویز پیش کی۔ نزہت! تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر بیٹی کہہ کر اس کی پاس داری کیسے کروں گا؟ اب تو تمام توانائیاں بھی ختم ہو چکی ہیں — آہ — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اسے بیٹی بنا لوں اور اس کے تقاضے پورے نہ کروں۔ خالو جان کی گھنی پلکوں سے ستارے ٹپک ٹپک کر رخساروں کو تر کر رہے تھے اور نزہت سوچ رہی تھی آج بھی ایسے افسانوی لوگ موجود ہیں جو دوسروں کا دکھ بانٹ لیتے ہیں۔ جو دوسروں کے لیے سراپا ایثار ہیں۔

عنبرین بی۔ اے کا امتحان دے چکی تھی۔ خانصاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا تھا۔ جس روز خانصاحب اپنے خاندان کے لوگوں کو لے کر کراچی روانہ ہوئے تھے خالو جان کو یوں لگا تھا جیسے زور کا زلزلہ آ گیا ہو۔ اور ساری کائنات کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ فلک بوس عمارتیں گرنے لگیں تناور درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے۔ انسانوں کی چیخ و پکار سے فضا کانپنے لگی۔ خالو جان نے ایک منہدم دیوار کے ملبے کے نیچے ایک چہرہ دیکھا جسے دیکھ کر وہ چیخ اٹھے شاکرہ! نہیں نہیں!! عنبرین!!

پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے خالو جان کو دیکھا اور افسوس کرتے ہوئے کہا خالو جان حواس کھو بیٹھے ہیں یہ بات محلے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ خالو جان پاگل ہو گئے ہیں۔ پھر خالو جان کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ سارا سارا دن اپنے کمرے میں کتابیں پڑھنے میں مشغول رہتے۔ دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گے۔ ایک نزہت ہی تھی۔

جو ان کے درد کو جانتی تھی۔ مگر اس کا علاج اس کے پاس نہ تھا۔ ایک صبح خالو جان خوش خوش آئے اور کہنے لگے نزہت!! عنبرین بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ مجھے بھی دعوت نامہ ملا ہے۔ اس کے ساتھ خانصاحب نے علیحدہ خط میں مجھے تاکید کی ہے کہ میں ضرور شامل ہوں۔ کل میں جا رہا ہوں۔ خالو جان اپنی ترنگ میں کہے جا رہے تھے۔

ضرور جائیے! آپ کو بھی بیٹی کی شادی مبارک ہو —— خالو جان! میری طرف سے عنبرین کو دعا کہیے گا اور واپسی پر شادی کی تفصیل سنائیے گا۔ نزہت نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر وہ سکوت توڑتے ہوئے بولے نزہت! عنبرین میری بیٹی ہے۔ میرے پاس پُر خلوص دعاؤں کے سوا اسے دینے کے لیے کچھ نہیں۔ ہاں کچھ نہیں — پھر خالو جان نے آنسو پونچھتے ہوئے پوٹلی کھولی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ میں اپنی عنبرین بیٹی کے لیے یہ لے جا رہا ہوں۔ اس میں میری زندگی کا سرمایہ —— نقدی —— اور کچھ زیور ہے۔ ایک حقیر تحفہ ہے۔ مگر خلوص سے بھرپور۔ ڈر ہے کہیں خانصاحب انکار نہ کر دیں۔

خالو جان! نزہت کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور چند آنسو ڈھلک کر اس کے آنچل میں آ گئے۔ نہ معلوم یہ آنسو ندامت کے تھے یا خوشی کے مگر گنگناتی ہوئی فضاؤں نے انہیں سمیٹ لیا تھا۔

پیار کے دیپ

پہلے روز جب وہ کالج میں داخل ہوئی تو اس کے دل و دماغ پر ایک انجانی خوشی کی پھوار لہرانے لگی اس کی جدھر بھی نظر اٹھتی رنگ برنگ کے خوشنما لباسوں میں ملبوس لڑکیاں تتلیوں کی طرح گیلریوں اور میدان میں اڑتی ہوئی نظر آتیں - جیسے وہ آسمانی پگڈنڈیوں پر تیر رہی ہوں رسیما کالج کے گوشے میں ہی کھڑی یہ نظارہ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ ایک شریر ہوا کا جھونکا آیا اور اس کی دراز زلفوں کو چھیڑتا ہوا گزر گیا۔ وہ بے چین سی ہو گئی - اس نے اپنی دراز ریشمی لٹوں کو جلدی جلدی سمیٹا۔ چند شریر لڑکیاں اس کے قریب سے ریمارکس دیتی ہوئی گزر گئیں۔

"ہائے سحر بنگال" دوسرے لمحے فضا میں ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا اور سیما کسمسا کر رہ گئی پھر اس نے اپنے شانے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کیا۔ ہائے اللہ!! وہ محویت سے چونکی اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک شوخ سی لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی شرارت کرنے آئی ہو۔ "فرمائیے" سیما نے قدرے چڑ کر کہا۔

ناراض نہ ہوں میں تو صرف اتنا پوچھنے آئی ہوں کہ آپ نئی اس کالج میں آئیں ہیں اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں"! سیما نے مختصر سا جواب دیا۔

"مجھے فاخرہ کہتے ہیں"۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہاتھ تو ملائیے! سیما نے ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ کو کئی جھٹکے دیتے ہوئے کہا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف بتائیے گا۔"

"جی شکریہ"! سیما نے ریشمی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

اور بائی بائی کہتے ہوئے چلی گئی ــــ سیما سوچنے لگی کہ بڑی بے تکلف ہے یہ لڑکی نہ جان نہ پہچان ـــــ میں فلاں ہوں ـــ تم کون ہو؟ کہیں کہیں کی!

دوسرے روز جب سیما اپنی کلاس روم میں داخل ہوئی تو وہی شریر سی لڑکی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی سیما ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی۔ دن گزرتے گئے سیما اپنی پرکشش

شخصیت اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب جلد ہی کالج کے ماحول پر چھا گئی۔ وہ کالج کے ہر فنکشن میں پورے جوش اور ولولے کے ساتھ حصّہ لیتی۔ ہر لڑکی اس سے بات کرکے ایک گونا خوشی محسوس کرتی تھی۔ سیما کالج کی ہر تقریب کی جان سمجھی جاتی تھی۔ کالج میں اگر مباحثہ ہے تو وہ اسٹیج پر آکر ماحول پر چھا جاتی اور موضوع کے اعتبار سے ایسی پُر مغز تقریر کرتی کہ ہر کوئی اس کی صلاحیت کو خراجِ تحسین پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ شعری نشست ہے تو وہ مشاعرہ کی حیثیت سے ترنم کے ساتھ یوں غزل سرا ہوتی کہ جیسے وہ فنِ شاعری کے رموز سے واقف ہے اور ہر صنف پر عبور حاصل ہے اور اُردو زباں اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مشاعرہ ہوگا جس میں اُسے انعام سے نہ نوازا گیا ہو۔ اگر ڈرامہ ہے تو المیہ کردار ہو یا طربیہ کردار ایسی مہارت سے پیش کرتی کہ ہر کوئی عش عش کر اُٹھتا۔

ایک بار کالج کے سالانہ فنکشن میں فینسی ڈریس شو میں ایک دیہاتی الہڑ دوشیزہ کا رُوپ دھار کر ناظرین کے سامنے آئی تو اس کی سیاہ دراز چوٹی کمر سے بھی نیچے جھول رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر دلفریب تبسّم نے اس کے حسن کو دوچند کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پریوں کے دیس سے ابھی ابھی اُتر کر آئی ہے۔ جب وہ مسکراتی تو اس کی لانبی ریشمی پلکوں کی چلمن اُٹھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا جیسے آکاش پر تارے جھلملا رہے ہوں۔ جس نے بھی اُسے دیکھا اس کے حُسنِ بے مثال کی داد دیئے بغیر

نہ رہ سکا۔ ٹیلی ویژن کیمرے کی آنکھ نے نہ معلوم کتنے زاویوں سے اُسے اپنے کیمرے میں محفوظ کیا۔ پریس فوٹوگرافروں نے اسے اپنے سرورق کے لیے منتخب کرکے نہ معلوم کتنے فوٹو لیے۔ اس روز اسے کالج میں آل راونڈر گرل کا اعزاز دیا گیا۔

کالج کی چھٹیاں ہو گئیں۔ اس کے انقلابی ذہن نے کتنی ہی خواہشات کو جنم دیا۔ اس نے آہستہ آہستہ انہیں عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ نئی نسل کے جذبات و احساسات کے ترجمان اخبار "گلشن" میں اُسے فیچر رائٹر کی جگہ مل گئی۔ اس نے بڑی چابکدستی سے پوشاک، فیشن، میک اپ اور خواتین کے دیگر مسائل پر ایسے فیچر لکھے کہ پڑھنے والوں نے اُنھیں بڑا سراہا۔ اور ایک ایسے مقام پر جبکہ پڑھنے والوں کا ایک حلقہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ اس کی بے چین فطرت نے صحافتی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ کچھ دنوں بعد ماڈل گرل کے رُوپ میں جب پہلی بار سلک ملز کے ملبوسات کے اشتہار پر نئے رنگ و رُوپ میں جلوہ گر ہوئی تو عوام نے اُن ملبوسات کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر تو دوسری ایڈورٹائزنگ فرموں نے بھی اپنے اشتہارات کے لیے اپنی خدمات حاصل کرنا چاہیں مگر اتنی مقبولیت کے بعد بھی اس نے دوسری بار کام نہ کیا اور پھر اچانک ایک دن صبح سویرے اس کی آواز ریڈیو پر سُنائی دی۔ اور صداکار کی حیثیت سے فضاؤں میں اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔ اس کی آواز میں رس تھا کہ سامعین اسے بار بار سننے کے لیے ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام

ڈائرکٹر کو خطوط لکھے، مگر اس کی عجیب و غریب پارہ صفت طبیعت نے اُسے ریڈیو اسٹیشن پر بھی نہ ٹھہرنے دیا اور پھر ایک روز وہ ٹیلی ویژن پر پہنچ گئی۔ اُسے نئے پروگرام "ہمسفر" میں اہم کردار مل گیا۔ جہاں اسے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کا موقعہ ملا۔ جس سے اس پروگرام کی اہمیت بڑھ گئی۔ مگر جلد ہی اس کا اس ہنگامہ پرور زندگی سے بھی دل بھر گیا۔ وہ بے چین سی رہنے لگی اسے رہ رہ کر اپنی سہیلیاں اور کالج کا پاکیزہ ماحول شدت سے یاد آنے لگا اور اس نے دیکھا جیسے وہ کالج کے احاطے میں کھڑی ہے۔ کالج کی پُرشکوہ عمارت اسے مُسکراتی ہوئی نظر آئی اور یوں لگا جیسے وہ اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہے۔ اس کے قدم تیز تیز اُٹھنے لگے۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو اُڑ کر اپنی سہیلیوں کی باہوں میں سما جاتی اور لپٹ کر خوب روتی۔ پھر اس نے کالج میں داخل ہونے کے لیے سٹاف روم کا سہارا لیا۔ ابھی وہ اسٹاف روم کے قریب ہی تھی کہ اچانک اس کی نظر پروفیسر اسلم پر پڑی۔

اس نے بھی سیمی کو دُور سے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

سیمی!

اس کی آواز میں بڑا خلوص جھلک رہا تھا۔

وہ رُک گئی۔

"فرمایئے ——————!"

آپ اتنا عرصہ کہاں رہیں ؟ اس کی آواز میں ایسی چاہت تھی جسے وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

بس ذرا مصروف رہی اسی لیے کالج نہ آسکی۔ اب تو شاید میرا نام بھی کٹ گیا ہوگا۔ اس نے آہستہ سے نرم آواز میں کہا۔

نہیں !

سیمی اسلم کے جواب پر چونک پڑی۔

پھر خود ہی بتانے لگا۔ مجھے یقین تھا سیمی کہ تم ایک روز ضرور آؤ گی۔ اسی لیے میں تمہاری ہر ماہ فیس ادا کرتا رہا اور چھٹی کی درخواست دیتا رہا۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بیمار ہے اس لیے نہیں آ سکتی۔

سیمی خاموشی سے ساری باتیں سُنتی رہی اور پھر اک دم سیما نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جن میں پیار کے ہزاروں دیپ جھلملا رہے تھے۔ سیما کے چہرے پر ایک تغیر رُونما ہوا۔

اسلم ——— !

سیما ——— !

جی ——— !

دونوں کی نظریں ایک ساتھ اُٹھیں ہم آہنگ ہوئیں اور دُور دیش کی موسیقی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

"چاند جاگتا رہا"

ہسپتال کی دیواروں اور سفیدے کے درختوں کے گھنے سائے آپس میں مل گئے تھے۔ دن کی روشنی شام کے دھندلکوں میں ملگجی فضا کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ ماحول بڑا سنسان تھا۔ لیکن پھر بھی اس مدفون سی فضا میں کوئی نرس، ڈاکٹر یا مریض برآمدے میں چلتا پھرتا دکھائی دے جاتا تو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ متحرک ہو۔ ہر چیز جیسے منجمد ہو گئی ہو۔ اس بے زبان سے ماحول میں جواد ایک بنچ پر بیٹھا آپریشن روم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی انجانی سی آسودگی محسوس کرتا تھا تو اس کے سوکھے ہونٹ پھیل کر ایک پھیکے سے تبسم کو جنم دیتے تھے۔ لیکن

اسی لمحے کچھ سوچ کر چوکنا ہو جاتا تھا اور اُچھل پڑتا تھا جیسے زہریلے بچھو نے ڈس لیا ہو۔ وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دُوسرے میں پھنسا کر اس طور سے مروڑنے لگتا جیسے اس تمام ذہنی کرب کو زائل کر دینا چاہتا ہو۔

آخر اس میں ہرج بھی کیا ہے؟ پھر نہ جانے لوگ اس ٹھوس حقیقت سے منکر کیوں ہوتے ہیں؟ لوگ! پاگل ہیں۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ ہر سُو بھوک۔ پھٹے کپڑے، نیم عُریاں جسم ننگ دھڑنگ سردی سے ٹھٹھرتے اور گرم لُو میں جلتے ہوئے انسانوں کی چلتی پھرتی لاشیں۔ پھر میں نے کوئی جُرم نہیں کیا —— میں مُجرم نہیں ہوں —— میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ پیٹ کی خاطر سب جائز ہے —— شرافت بے نام سی چیز ہے۔ دولت ایک معیار ہے۔ اِنسان بِک جاتا ہے۔ ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ تہذیب دولت کی جھنکار کا دُوسرا نام ہے۔ انسانیت.... اخاہ!.... اخاہ!! ایک ڈھونگ ایک دھوکہ —— یہ سب بھوک کا چکر ہے۔ دولت ایک چابی ہے جو ہر قُفل کے لیے "کھل جا سم سم" کا حکم رکھتی ہے۔

معاشرہ! غریب کے لیے دیوارِ چین لیکن دولت مند کے سامنے ریت کی دیوار اس کے اشاروں پر سوسائٹی ناچتی ہے۔

جواد کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کہ اتنے میں آپریشن رُوم کے دروازے کی بے ہنگم آواز نے اس یخ بستہ ماحول میں ارتعاش پیدا کیا اور پھر موت کی سی خاموشی فضا میں تحلیل ہو گئی۔ نہ جانے یہاں کتنی

آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ان بلند بالا عمارت کے بھاری بھرکم پتھروں سے ٹکرا کر صدائے صحرا بن جاتی ہیں۔ یہاں چیتھڑوں میں ملبوس انسانیت کی چیخ ایک گلی میں سوئے ہوئے زخمی کتے کی بھیگی رات میں لمبی سی درد بھری ہوک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

جوّاد بہک گیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور سامنے دیکھنے لگا۔ جب ڈاکٹر فرحی کو موجود پایا تو ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اور معمولی سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے پوچھنا چاہا کہ "نجوؔ اب کیسی ہے"۔ جوّاد صاحب!! ایک رسیلی آواز اس کے کان میں پڑی جس نے کچھ دیر کے لیے تو ایک خاص لذّت محسوس کی۔ آپریشن کامیاب رہا۔" فرحی نے لچکتی ہوئی آواز میں اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ سچ!! ڈاکٹر صاحبہ!! جوّاد نے تعجب سے پُوچھا جیسے اُسے یقین نہ ہو۔

اور ڈاکٹر فرحی یہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جوّاد کتنا سمجھ دار ہے! اُسے نجوؔ کا بھی بہت خیال ہے ٹھیک ہی تو ہے جان ہے تو جہان ہے۔ فرحی اپنے خیالوں میں گم کمرے میں داخل ہو گئی۔ نہ معلوم کیوں اپنے انگ انگ میں درد محسوس کرنے لگی جیسے وہ بھاری مشقت کے بعد تھک کر چور ہو گئی ہو۔ حالانکہ یہ آپریشن اس کے لیے معمولی نوعیت کا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے جب اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو چھ بج چکے تھے۔ جلدی سے اُٹھی پرس سنبھالا اور کار میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل دی۔

راستے میں جب اس کی کار کسی موڑ سے گزرتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کئی روحیں اس کی کار کو ... تلے دب کر کچلی گئی ہوں۔ جگہ جگہ وہ لاشعوری طور پر جلدی سے بریک لگاتی تو اسے احساس ہوتا کہ جیسے اُسے کوئی پکار رہا ہے۔ لیکن جب دُور دُور تک سڑک صاف دیکھائی دیتی تو چونک پڑتی اور اس کی نظروں کے سامنے انسان، بچے، کھلونے، لباس اور ترقی کے بلند مینار مدھم ستاروں کی طرح جھلملانے لگتے۔ فرحی کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ گول باغ سے مڑتے ہوئے یک لخت اسٹیرنگ پر ناچتے ہوئے نازک ہاتھ رُک گئے اور وہ باہر دیکھنے لگی۔ اسے جھگیوں کے پاس بہت سے کالے کلوٹے ننگے سر ننگے پاؤں گرد میں لپٹے ہوئے اور سڑسڑاتی ناک والے بچے کھیلتے دکھائی دیئے۔ نہ جانے ان میں سے ایک بچے کو کیا سوجھی کہ ہاتھ میں اٹھایا ہُوا پتھر لیئے کار کی طرف بجلی کی سی تیزی سے لپکا اور اگر اس نے کار تیز نہ کر لی ہوتی تو شیشہ چکنا چور ہو جاتا۔

جب فرحی گھر پہنچی تو اس کا دل بوجھل تھا۔ اس نے ریڈیو سُننا چاہا لیکن اس میں سے اُبھرتی ہوئی درد بھری آوازوں نے اس کے دل کو اور پریشان کر دیا۔ وہ جلدی سو جانا چاہتی تھی لیکن نیند کی دیوی شاید اس سے ناراض تھی۔ آخر وہ سوچتے سوچتے سو گئی اور اس کے ذہن کے پردے پر جواد اور نجو کی تصویر مثبت ہونے لگی۔ جواد اور نجو ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے خوشی میں جھوم

رہے ہیں ۔ پاس ہی ان کا خوبصورت لڑکا رنگ برنگ تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے ۔ اور خوشی میں تالیاں بجاتا ہے "بجو دیکھو! کتنے خوش رنگ پھول ہیں۔ جواد ایک پھول توڑ کر اس کے بالوں میں اٹکا دیتا ہے اس پر دونوں ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ وہ کچھ دُور نکل جاتے ہیں کہ بچے کی دلدوز چیخ پر دونوں اس کی طرف لپکتے ہیں لیکن سانپ اپنا کام کر چکا ہوتا ہے لاکھ کوشش کے باوجود پھر ایک دم جواد اور بجو اس کے سامنے آجاتے ہیں جواد بڑی انکساری کے ساتھ کہتا ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحبہ کیا آپ پھر آپریشن کریں گی؟ فرحی کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن دونوں تصویریں مٹ جاتی ہیں۔

فرحی نے کروٹ لی اور پھر سو گئی۔ اب اسے کوٹھی کے لان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے شور مچاتے دکھائی دیتے ہیں کوئی پھول توڑ رہا ہے تو کوئی دوسرے کو چٹکی بھر کر شرارت آمیز قہقہہ لگاتا ہے۔ ذرا ان سے ہٹ کر دو بچے ان کھیلتے ہوئے بچوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔

یہ بچے کتنے حسین ہیں!!

کیا یہ سب میرے بچے ہیں!! نا بابا اتنے سارے بچوں کو میں کیا کروں گی۔ وہ کمرے سے باہر نکلتی ہے اور سیدھی ان کے پاس جاتی ہے۔ ان میں ایک نہایت حسین و جمیل بچہ آگے بڑھتا ہے۔ فرحی کا دل چاہتا ہے کہ اسے گود میں لے کر جی بھر کر پیار کرے لیکن بچہ فوراً پیچھے ہٹ

جاتا ہے۔ کون ہو تم؟ فرحی نے اس سے پوچھا۔

کیا تم نہیں جانتی ہو۔ میں بچہ ہوں۔ یہ کہہ کر وہ کچھ سوچنے لگتا ہے۔ جب فرحی اسے دوبارہ دیکھتی ہے تو اس کے گلاب سے رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس کے چہرے کے خدوخال دھندلا جاتے ہیں اور ایک دوسرا "بچہ" فرحی کے سامنے سر پر سرخ پگڑی باندھے ہاتھ میں چھڑی لیے کھڑا ہے وہ ایسا لگتا ہے جیسے ننھا منا کوچوان ہو۔ جو لوگوں کے بوجھ کو اپنا بوجھ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ جو گھوڑے کو اپنے نازک ہاتھوں سے پیٹتا ہے اور پھر اُسے گھوڑے کی بے بسی پر پیار بھی آتا ہے۔

اے کوچوان کے بچے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ تیرا یہاں کیا کام ہے؟ کیا تو ان کو بھی اپنے جیسا بنانا چاہتا ہے جاؤ!! بھاگ جاؤ یہاں سے۔

تھوڑی دیر میں جب فرحی نے اس کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کو میں نے ایک ماں کی گود کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ اور فرحی کو صرف ایک آواز —— سی گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں دھرتی کا بوجھ تو نہیں ہوں۔ میں دوسروں کے بوجھ اٹھانے والا ہوں۔

فرحی واپس مڑنے لگتی ہے کہ بہت سے بچوں کے قہقہوں اور چیخوں نے اُسے روک لیا۔ اب تمام بچوں کی آنکھوں میں معصوم مسکراہٹ کی بجائے وحشت ناچ رہی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو تیر کی طرح

سیدھے کئے ہوئے فرحی کی طرف بڑھتے ہیں اور ایک ساتھ آواز
بلند ہوتی ہے۔

اے بے رحم ماں!! ۔۔۔۔۔۔ اے دھرتی کی پاسبان!!
بتا ہم نے تیرا کیا قصور کیا ہے ——————؟

فرحی ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ کر گیلری میں آجاتی ہے۔
خالد!! خالد! فرحی نے چیختے ہوئے آواز دی۔
فرحی! ہوش کرو شاید تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔
خالد!! خواب نہیں حقیقت!!
مجھے ذرا لان میں لے چلو۔
اس وقت رات کے دو بجے ہیں اب لان میں کیا کرو گی؟
وہاں میرے بچے کھیل رہے ہیں دیر نہ کرو خالد وہ میرا انتظار کر رہے
ہیں۔
فرحی کیا ہوگیا تمھیں؟
خالد فرحی کو سہارا دے کر لان تک لے جاتا ہے۔
وہاں کچھ بھی نہیں لیکن پھر بھی فرحی تلاش کرنے کے انداز میں ادھر ادھر
دیکھ رہی ہے۔ گھاس پر آم کے درخت سے گرے ہوئے پتے چاندنی
روشنی میں اُسے یوں محسوس ہوئے جیسے ننھے بچوں کے ننھے قدموں
کے نشان ہوں۔ تھوڑی دیر وہ گھاس پر منتظر بیٹھی رہی پھر خالد کے
ساتھ آکر اپنے کمرے میں چلی گئی اور جب دوسرے روز وہ نیند سے بیدار

ہوئی تو اُسے اپنا جسم پھول کی طرح ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔
اُس نے خوشی خوشی خالد کے لیے خود ہی ناشتہ تیار کیا اور اس کے کمرے میں چائے لیکر داخل ہوئی۔ خالد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ وہ ہی فرحی ہے جو کبھی نو بجے اُٹھتی تھی۔

فرحی میں کیا دیکھ رہا ہوں؟

خالد میں نے فیصلہ کیا ہے ڈیوٹی پر نہیں جاؤں گی۔

فرحی ایک ڈاکٹر کو ایسا نہیں سوچنا چاہیئے۔ انسانیت کی خدمت ڈاکٹر سے زیادہ اور کون کر سکتا ہے؟

خالد میں ڈاکٹر ضرور ہوں لیکن ———————— !!

اور خالد فرحی کا مُنہ دیکھتے ہی رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ !! — ؟

بھینٹ

رشی! بیٹیا رشی!!

کدھر مر گئی نہ جانے دن بھر شیشے کے سامنے کھڑی کیا دیکھتی رہتی ہے۔ ہم بھی جوان ہوئے تھے لیکن یہ سب کچھ اب ہی دیکھتے ہیں۔

امّی! میں یہاں ہوں باورچی خانے میں!!

ٹھہریے امّی جان میں ابھی آتی ہوں۔

رشیدہ نے اپنے ہاتھ صاف کیے اور کمرے میں امّی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

کیا بات ہے امی جان!
رشیدہ بیٹی! ابھی ابھی جمن بی آئی تھی۔
کوئی ہوگا پیغام۔ رشیدہ نے بات کاٹی اور دوسرے کمرے میں صفائی کی خاطر جانے لگی تو رشیدہ کی امی نے اسے کہا۔
"بیٹی سب چیزیں ذرا اچھی طرح صاف کرنا اور اپنی اپنی جگہ سجا دینا وہ لوگ غالباً کل آئیں گے۔ جمن بی کہتی تھی بڑے اچھے لوگ ہیں۔
ہاں!! رشیدہ یاد آیا۔ ساتھ والے چوہدری صاحب کے ہاں سے ان کی بیگم سے کہہ کر کچھ کرسیاں بھی منگوا لینا اور میز تو سامنے والوں کا پہلے سے پڑا ہے۔ دیکھو اپنی سہیلی کے ہاں سے گلدستے بنوا کر منگوانا نہ بھولنا۔
اچھا امی جان! اچھا سب ہو جائے گا۔
رشیدہ جھاڑو سے فارغ ہو کر کپڑے سے کمرے میں پڑی ہوئی چیزوں کو صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اچانک اُسے خیال آیا کہ آج اگر یہ آنے والے مہمان پھر ایسے ہی چلے گئے تو نہ جانے پھر کتنے دن تک اُسے انتظار کرنا پڑے گا۔

رشیدہ کے ہاں جب بھی کوئی مہمان عورت اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ آتیں تو اس کی اُمید بندھ جاتی کہ شاید ــــــــــــ
رشیدہ!! باجی ــــ باجی! اس کے چھوٹے بھائی نے آواز دے کر بلانا چاہا۔
آواز سنتے ہی اس کے خیال کا تانا بانا بکھر گیا۔

باجی آج ہمارے ہاں کون مہمان آرہے ہیں ؟

فیصل !! جی باجی . . . . تمہیں مہمانوں سے کیا لینا ہے ؟ ڈانٹ کر رشیدہ نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا۔ پھر بھی باجی پوچھنے میں ہرج ہی کیا ہے ؟

تم میری باجی ہو اور میں تمہارا چھوٹا بھائی۔

فیصل تم ایسا کرو کہ جاکر بازار سے مہمانوں کے لیے ناشتہ لے آؤ۔ اتنے میں دودھ والا بھی آجائے گا۔ رشیدہ نے بڑی خوبصورتی سے اپنے بھیا کی بات ٹالتے ہوئے کہا۔

یہ کہکر رشیدہ باورچی خانے میں پیالیوں کو نہایت خوبی سے چمکانے لگی۔ اور سوچ کی اتھاہ میں اپنے مستقبل کی لکیریں پڑھنے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ سیدھا کرکے اس پر لکیریں دیکھیں تو اُسے باورچی خانے کے فرش پر بکھری ہوئی بے شمار لکیریں دیکھ کر کچھ احساس ہوا۔ اور اس نے ہتھیلی بند کرلی۔

"باجی" ! فیصل کی آواز سے چونک گئی۔

مٹھائی دیکھو بالکل تازہ ہے اور بسکٹ بھی گرم ہیں۔

لڈو ادھر رکھو۔ امی جان کئی بار چائے کا پوچھ چکی ہیں۔

فیصل ذرا دھیان سے لے کر جانا کہیں ایسا نہ ہو کہ جلدی میں ٹرے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ چند منٹ بعد فیصل چائے لے کر مہمانوں کے کمرے میں گیا۔

بہن یہ میرا لڑکا فیصل ہے۔ اور فیصل نے سامنے بیٹھی ہوئی عورت کو جھک کر سلام کیا۔

جیتے رہو بیٹے!!

کون سی کلاس میں پڑھتے ہو؟ اس بوڑھی خاتون نے سوال کیا۔

بہن اس سال بڑی مشکل سے میڈیکل میں داخل کرایا ہے۔ آگے دیکھیے کیا کرتا ہے۔ ویسے تو پڑھنے میں ہوشیار ہے۔

ذرا رشیدہ کو تو اندر سے بلواؤ!! ہم بھی دیکھیں اپنی ہونے والی بہو کو۔

ابھی آتی ہے۔ رشیدہ کی امی نے اطمینان سے کہا۔

رشیدہ نے چائے اندر بھیج کر دیوار سے لگے آئینہ میں اپنے آپ کا جائزہ لیا اور ایک گونا خوش ہو کر اطمینان سے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی ہی تھی کہ امی کی آواز نے اُسے متوجہ کر لیا۔

رشیدہ بیٹی اندر آجاؤ!

اتنے میں رشیدہ سمٹی سمٹائی لجاتی اندر داخل ہوئی اس نے مہمان خواتین کو نہایت ادب سے سلام کیا اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

بیٹھ جاؤ بیٹی! ایک بزرگ عورت نے کہا۔

میرے پاس آجاؤ ——— یہاں بیٹھو۔

بھابی جان جمن بوا ٹھیک کہتی تھی واقعی بہو چاند ہے۔ سلیقہ شعار نظر آتی ہے۔ جوڑی خوب رہے گی۔ اپنا تسنیم بیٹا بھی تو کسی سے کم نہیں۔" پاس بیٹھی ہوئی دو عورتیں آپس میں باتیں کر رہی

تھیں۔

ہاں بہن توجمن بوا نے تو تم لوگوں کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

لڑکا برسرروزگار ہے۔ ماشاءاللہ خوب صورت ایسا کہ لاکھوں میں ایک لگے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

بہن! جمن بی نے تو پہلے روز ہی بتا دیا تھا۔

لیکن آپ کی پسند بھی تو دیکھنا ہے۔

بہن! ایسی بات نہیں تسنیم کی امّی نے جواب دیا۔

تمہاری بیٹی ماشاءاللہ نظر نہ لگے۔ خوب صورت ہے خوش سلیقہ بھی ہوگی۔ بس باقی توجمنؔ بی نے بتا دیا ہوگا۔ اس کے مطابق کچھ بندوبست ہونا چاہیئے"۔

اچھا تو اب ہم چلتے ہیں سوچ کر جمنؔ بی کو پیغام بھجوا دیجئے گا۔

ہم آپ کے جواب کا دو چار دن تک انتظار کریں گے۔

مہمانوں سے فارغ ہو کر رشیدہؔ کی امّی بیٹھک میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ بی جمن تو بہت کچھ کہہ رہی تھی۔ جو ہمارے بس میں بھی نہیں۔

کہ رشیدہؔ کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکیں گے۔ وہ اتنا جہیز مانگتے ہیں کہ ہم کہاں سے بندوبست کریں گے؟ وہ ابھی اٹھ کر صحن میں آنے والی تھیں کہ رشیدہؔ کے ابّاؔ اندر داخل ہوئے اور بیگم سے پوچھا۔

کچھ معاملہ طے ہوا؟ یا یہ بھی اسی طرح کچھ کہہ کہلا کر چلی گئیں ہیں؟

بس یہی سمجھئے ! ۔۔۔۔۔۔

لیکن اس بار کچھ نہ کچھ کیجئے ۔ میری بیٹی کب تک ان سونی سونی کلائیوں کو لیے بیٹھی رہے گی ۔

بیگم !!

آخر تم ہی سوچو ——— میں کیا کرسکتا ہوں ۔

ابھی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ فیصل اندر داخل ہوا ۔

امّی جان کیا بات ہے ؟

آپ لوگ کیوں پریشان ہیں ۔ بیٹا ! پریشان نہ ہوں تو کیا کریں ۔ بیٹی پرایا دھن ہے ۔ اس کی فکر ہے ۔

تو کیا باجی رشیدہ کی بات ہو رہی ہے ۔ فیصل نے شوخی کی ۔

اس کی شادی تو شاید قیامت تک نہ ہو ۔

ایسا نہیں کہتے بیٹے وہ تمہاری بہن ہے ۔ اس کے لیے اگر بھائی کچھ کر نہ سکیں تو اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہیئے ۔

اچھا امّی جان ۔ گستاخی ہوئی معاف کردیں ۔

میں تو بھول ہی گیا تھا آپ سے کہنا کہ دعا کریں کل میں کالج کے الیکشن میں یونین کے صدر کی حیثیت سے کھڑا ہو رہا ہوں ۔ کامیاب ہو جاؤں تو دیکھیں گے ۔

اللہ تجھے کامیابی دے ۔ بیٹا ! آمین ۔

دوسرے روز صبح سویرے فیصل گھر سے کالج چلا گیا ۔ اس کے ساتھ بہت

سے دوسرے دوست تھے۔ اور سب بہت خوش تھے۔

شام کو جب فیصل گھر آیا تو اس کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے۔ اور وہ خوشی سے پھولا نہ سمار ہا تھا۔ لڑکوں نے اسے کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ بے باک لیڈر زندہ باد ـــــ فیصل زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ اس شام رشیدہ نے ان پیسوں سے مٹھائی منگا کر فیصل کے دوستوں کا منہ میٹھا کرایا۔ جو کافی دنوں سے اس نے پس انداز کر رکھے تھے۔ فیصل اب کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بھی زیادہ ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی رشیدہ دیکھتی کہ گھر میں آنے والے مہمانوں کی چائے وغیرہ کا بندوبست کرنا ہو تو فیصل اپنے پاس سے کر لیتا ہے۔

ایک دن فیصل نے کالج جاتے ہوئے رشیدہ سے کہا۔

باجی! امی جان سے کہہ دیں کہ شادی اور جہیز کی فکر نہ کریں۔ میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا۔

فیصل بیٹھک میں بیٹھا بے چینی سے کسی کا انتظار کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں ایک لمبی سی کار رکی اور پھر اس میں سے چند معزز آدمی نکلے۔ فیصل شاید ان کا ہی منتظر تھا۔ وہ دیکھتے ہی ان کے استقبال کے لیے بڑھا۔ فیصل کو دیکھتے ہی وہ تمام کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

واہ بھئی خوب تقریر کی آپ نے تو خوب رنگ جمایا۔ واہ واہ!! تقریر کیا تھی سحر تھا سحر۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر فیصل کے ہاتھ میں ایک

بیگ تھما دیا اور آگے آگے چلنے لگا۔

آیئے صاحب! یہ غریب خانہ ہے سب بیٹھک میں داخل ہو گئے کافی دیر تک سیاسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں مستقبل کے پروگرام بنتے رہے چائے کے بعد جب وہ جانے لگے تو ان میں سے ایک نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

فیصل بیٹے! کل جلوس کامیاب ہونا چاہیئے۔ نہ صرف کالج کے تمام لڑکے شامل ہوں بلکہ کچھ جوان باہر سے بھی لے لیں۔ تو ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ ملک صاحب بے فکر رہیئے۔ اسی طرح ہو گا۔ فیصل نے کہا

اچھا تو پھر ہم چلتے ہیں۔ کل رپورٹ دینا۔

باقی وہ بیگ تمھارا ہی ہے۔ اپنے مسائل حل کرو۔

فیصل آج بہت خوش تھا۔ اس نے وہ بیگ اپنی امّی کے کمرے میں پڑے ہوئے صندوق میں رکھ دیا تھا۔

صبح سویرے ہی کالج کے لڑکے آنے شروع ہو گئے۔

فیصل زندہ باد ——— فیصل زندہ باد کے نعرے فضا میں گونجنے لگے وہ لڑکوں کے ہجوم کے جلوس کالج کی سمت روانہ ہو گیا۔ شہر میں جلوس نکلا مال سے ہوتا ہوا جب لاٹ صاحب کی کوٹھی کے بالمقابل پہنچا تو اس وقت فیصل جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ کالا قانون ختم کرو۔

ابھی یہ الفاظ پورے ہی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک گولیوں کی آواز آنی شروع ہو گئی اور تھوڑی ہی دیر میں دیکھتے ہی دیکھتے فیصل گولیوں

کی نذر ہوگیا۔ ہرطرف بھگدڑ مچ گئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم غائب ہوگیا۔

فیصل تارکول کی پگھلی ہوئی سڑک پر خون میں لت پت مُردہ پڑا تھا۔ اور اس کے گرد پولیس کے دو سپاہی کھڑے تھے۔

رشیدہ نے امّی کو بتایا کہ فیصل نے آپ کے صندوق میں بیگ رکھا ہے۔ اسے آپ نے دیکھا نہیں۔

رشیدہ کیسا بیگ؟

وہ لوگ جو آئے تھے۔ انہوں نے اسے دیا تھا۔

رشیدہ کی امّی نے کمرے میں جاکر فوراً دیکھا تو بیگ وہاں ہی پڑا تھا۔ اس کو جب رشیدہ نے کھولا تو اس میں رقم کے علاوہ ایک خط بھی تھا۔

امّی جان!

آپ باجی کا جہیز وغیرہ ان لوگوں کی مرضی سے بنائیں اور باجی کی شادی بھی دھوم دھام سے ہونی چاہیئے اور اگر میں نہ رہوں تو باجی جان مجھے معاف کر دینا۔

میں اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔

رشیدہ اور اس کی امّی نے جب بیگ کے نچلے حصے میں دیکھا تو حیران رہ گئیں۔

کوئی چالیس ہزار کے کرنسی نوٹ تھے۔

لیکن رشیدہ یہ سب کیا ہے - اس کے پاس اتنی رقم آئی کہاں سے؟
وہ ابھی ماں بیٹی اس معمہ میں اُلجھی ہوئی تھیں کہ باہر گلی میں شور کی
آواز سُنائی دی۔

فیصل طالب علم لیڈر کو گولی مار دی گئی ہے۔ مخالف پارٹی
کے کسی فرد نے گولی چلائی تھی۔

کچھ کہہ رہے تھے - آج کے لیڈر پارٹیوں کے ہاتھوں
اپنی جان کی قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ مگر کچھ اس کے جذبہ کی
داد رہے تھے کہ ظلم کے خلاف کس طرح سینہ سپر ہوا اور کس انداز
پر جان دی۔ مقصد کتنا بلند تھا۔

فیصل تو نے یہ کیا کیا - میرے جہیز کے لیے جان کی بازی لگادی
مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے نہیں چاہیئے - بہن چلا رہی تھی اور ماں
پاس ہی کھڑی سب کچھ ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کسی بات کی خبر نہ ہو
آہ تو سماج کی اسی رسم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اک دم ماں سکتہ کی حالت
میں چیخی اور گلی میں آگئی - اور فیصل زندہ باد! زندہ باد فیصل کے نعرے
مارتی قہقہے لگاتی گلی کے موڑ سے بھی آگے نکل گئی ۔

سہارا

از :- صبیحہ رحمٰن

کردار :-

۱ :- ایاز ——

۲ :- نوشین —— نوشی

۳ :- عفت —— عفی

۴ :- فہمیدہ —— فومی

۵ :- عامر ——

۶ :- خانصاحب ——

۷ :- بابا زنگو ——

"سہارا"

فہمیدہ !! ——— میری اچھی بہن !

"میرے لیے چائے تو بنا لاؤ" نوشین نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ اس کے بعد اس نے ہینڈ بیگ کو دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی سے لٹکا دیا۔ اور پاس ہی پڑے ہوئے صوفہ پر نیم دراز ہو کر سستانے لگی۔ وہ آج شاید بہت تھک گئی تھی کیونکہ جلد ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس کی خوبصورت پلکوں کی جھالر سے نیند کا خمار ٹپکنے لگا۔

فہمیدہ ناول پڑھنے میں بری طرح محو تھی۔ اس نے نوشین کی بات پر بالکل دھیان نہ دیا۔ وہ ناول پڑھنے میں اس قدر منہمک تھی کہ نوشین کا اُسے بالکل خیال تک نہ رہا تھا۔ اب شاید باب ختم ہونے کو تھا۔

کہ اس نے نظریں اُوپر اٹھا کر اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھا تو اُسے نوشین کی آمد اور اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر دل ہی دل میں بڑبڑانے لگی۔

نوشی باجی !! ——— عجیب بور ہیں۔

کیا ٹھاٹ ہیں صاحبہ کے ——— آتے ہی حکم چلاتی ہیں۔

اُف !! ——— کیا مزہ آرہا تھا۔؟ کیا دلکش منظر تھا۔؟

جھیل کے کنارے پتھر پر ہیروئین اور ہیرو بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جھیل کے نیلگوں پانی پر ہوا کے جھونکوں سے ہلکی ہلکی لہریں اُبھر رہی تھیں۔ دُور کوئل کی کوک سماں باندھ رہی تھی۔ سورج کی دوپہلی کرنیں سطح آب پر بکھر رہی تھیں۔ ہیروئین نے ہیرو کے شانوں پر اپنے سر کو رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اس کے لمبے سیاہ بال ہیرو کے شانوں پر بکھر بکھر کر نیچے لٹک رہے تھے اور ہیرو نے بڑے رومانی انداز میں ہیروئن کے بید کی طرح لچکتے بدن کو اپنے مضبوط بازوؤں سے سہارا دے رکھا تھا۔

فہمیدہ نے کندھوں کو جھٹک کر بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

سب مزہ کرکرا کر دیا ہے نہ جانے کہاں کہاں سے گھوم پھر کر آئی ہیں اور گھر میں داخل ہوتے ہی یہ کمرو ! وہ کرو !!

یہ ایسے ہے ——— ویسے کیوں ؟ ——— یہ نہیں ہوا ——— وہ نہیں ہوا۔ ایک طوفان سر پہ اٹھا لیتی ہیں۔

ہاں! ابھی کیا کریں ——— مجبوری ہے ——— مجبوری دھونس ہے ——— کماؤ جو ہیں نا ——— یہ کہتے ہوئے فہمیدہ نے ناول کو بڑے زور سے پٹختے ہوئے کارنس پر رکھ دیا۔ اور خود باورچی خانے کی طرف چل دی۔

جاتے ہوئے اس نے اچٹتی سی نگاہ نوشین پر ڈالی۔ نوشین کے جوڑے میں لگے ہوئے پھولوں میں سے ایک دو پھول نیچے فرش پر گر گئے تھے۔ ان کو دیکھ کر فہمیدہ نے پہلے تو چاہا کہ اٹھا کر دوبارہ نوشین کے جوڑے میں اٹکا دے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے آواز دی۔

نوشی باجی!! ——— نوشی باجی

آپ کے جوڑے کے پھول گرے پڑے ہیں۔ اٹھا کر اچھی طرح سجالو پھول اچھی طرح سے جوڑے میں سجایا کرو۔ پھول کا یوں جوڑے سے گرنا اچھا شگون نہیں ہوتا ———!

جب یہ باتیں نوشین کے کانوں میں پڑیں تو اس نے کہا۔

اچھا! ——— اچھا شکریہ!!

"تم میرے لیے چائے تو بنا لاؤ"۔ نوشین نے تاکید سے کہا۔

جاتی ہوں ——— باجی ———!

ہمارا کیا ہے ——— ہم تو آپ کے نوکر ہیں تعمیل حکم بجا نہیں لائیں گے۔ تو گھر میں کیسے رہیں گے۔؟ فہمیدہ نے ہلکی سی طنز کی۔ اور دروازے سے نکل کر کچن کی طرف چلی گئی۔ روز کا معمول تھا یہ نشتر تو روز ہی

لگائے جاتے تھے۔ اب تو نوشین اس کی عادی ہو گئی تھی۔ قمی کی بات سننے کے بعد جب نوشین نے فرش پر نگاہ ڈالی تو واقعی پھول گرے ہوئے تھے۔ پھولوں کو دیکھ کر اسے اپنا دل زور سے دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ تو وہی پھول تھے جو ایاز نے گول باغ میں سیر کرتے ہوئے بڑے چاؤ کے ساتھ اس کے بالوں میں سجائے تھے۔ اور پھر جب اس نے شکریہ ادا کیا تھا تو ایاز نے مسکراتے ہوئے نرم آواز میں کہا تھا یہ میری طرف سے تحفہ قبول کر لو۔ اسی سوچ میں نوشین نے جھک کر گرے ہوئے پھول اٹھا لیے اور گنگنانے لگی۔ گنگنانے میں اسے جو سرور آیا۔ اس سے پہلے کبھی گانے میں بھی نہیں آیا تھا۔ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنا جائزہ لیا۔ آج وہ اپنے آپ کو بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔ رہ رہ کر اسے ایاز کا خیال آ رہا تھا۔ جو سراپا خلوص ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا سب کچھ وہی ایاز جو غم روزگار میں برابر کا شریک رہا۔ ایک محافظ کی طرح اس کی عزت کی حفاظت کرتا تھا۔ اس کے ناموس کے لیے لوگوں سے لڑا۔ اس کا خیال آتے ہی نوشین نے پھول پھر سے جوڑے میں سجا لیے۔

اب ایاز اس کے خیالوں کا محور بن گیا۔ ایک خیالی شہزادے کی طرح اس کی خیالی دنیا میں راج کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ ایاز کی انگلیاں اس کے ریشمی بالوں سے کھیل رہی ہیں۔ کبھی اس کو یوں لگتا۔ جیسے ایاز اس کے قریب بہت قریب بیٹھا سرگوشیاں کر رہا ہے۔

پھر دُور سے شہنائیوں کے بجنے کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولنے لگتی۔ اور ان شادیانوں میں اس نے ایاز کے ماتھے پر سہرے کی لڑیوں کو لہراتے دیکھا۔ پھر یوں لگا جیسے اس کی سکھیاں اسے دلہن بنا رہی ہیں۔

ایاز ـــــ کتنا سویٹ ہے ـــــ چلتے ہوئے کتنا سمارٹ لگتا ہے۔ باتیں اس قدر دل موہ لینے والی کرتا ہے کہ سُننے والا کبھی بور نہیں ہوتا۔ میرے لیے اس نے دنیا کی مخالفت مول لی۔ اسی کے سبب بہت سے بھیڑیوں نے پناہ لی۔ اگر زندگی کی راہ میں وہ نہ ملتا ـــــ اُف!! میرا انجام کیا ہوتا۔۔۔۔

معلوم نہیں۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں قسمت بن جاتیں۔ ایاز ـــــ ایاز ـــــ ایاز

پھر کچھ رُکتے ہوئے۔

"نوشی!! نوشی" ـــــ نوشین نے اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اس کا احساس پندار جاگ اُٹھا تھا۔

ایاز ـــــ اتنا حسین تو نہیں۔ ناک نقشہ بھی واجبی ہے۔ رنگ بھی بس واجبی سا ہے۔ لباس بھی فنکاروں جیسا ہے۔ ہاں ہے بھی تو فنکار۔ بہت بڑا فنکار۔ کسی کے دل میں چپکے سے داخل ہونا بھی تو فن ہے۔ اس کا سلوک، اس کی ہمدردی ـــــ ہاں! یہ بھی تو فن ہے۔ اس کی سیرت بہت سویٹ ہے۔ اس کی روح بہت سمارٹ ہے۔

نوشی !! سوچ لو ـــــ زندگی بھر کا مسئلہ ہے اس کی سوچ نے کروٹ لی ـــــ پھر اس نے اپنے دل سے سوال کر ڈالا۔

دل کا کیا ہے۔ دل تو چاہتا ہے کہ ایازؔ کی ہر بات مان لی جائے۔ مگر دماغ کہتا ہے۔ نوشی ہوش کا دامن نہ چھوڑنا۔ یہ راہ کٹھن ہے لوگ کیا کہیں گے۔ قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچو۔ زندگی کے فیصلے جلدی نہیں ہوتے۔ پھر بھی نہ جانے ایازؔ کی شخصیت میں کون سی دلکشی ہے۔ جو دل میں اتری جاتی ہے۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے نوشین ایازؔ کے خیالوں کے جال میں بُری طرح پھنس گئی۔ اس نے اپنے آپ کو ان خیالوں کے تار پود سے آزاد کرانا چاہا۔ تب اس نے زور سے پُکارا۔

فہیدہ ! ـــــ فہیدہ کی بچی !

کیا چائے تیار نہیں ہوئی۔ جلدی کرو نا ! میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے یونہی نوشین نے بہانہ کرتے ہوئے ایازؔ کے تصوّر سے نکلنا چاہا۔

فہیدہ جو ابھی تک ناول کی ہیروئن کے خیالوں میں گم تھی۔ اس کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ کر چھناک سے ٹوٹ گئی۔

ارے کون ہے ؟ ـــــ کچن میں۔

فہمی ہے کیا ؟ ـــــ توبہ ـــــ !!

ہر روز برتن توڑنا تمہارا معمول بن گیا ہے۔ کیا ہاتھوں میں جان ہی نہیں رہی۔ نوشین کی امی غصّے میں بولی۔

نوشین کے خیالوں کا تانا بانا بکھرنے لگا۔

اُف!! میرے اللہ — نوشین کی زباں سے بے اختیار نکلا۔
نوشی! ممی غصہ میں فہمیدہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔
کیا کر رہی ہو — ؟
او ہو! — کیا غضب ہے؟ کیا یہ چائے پینے کا وقت ہے؟ — نوابی شان ہے —
ہائے ہائے!! کیسی لڑکی ہے۔ نوشین کی ممی نے عادت کے مطابق چلاتے ہوئے کہا۔
اس پر فہمیدہ نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔
ممی!! — نوشی باجی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ کہ اچانک ہاتھ سے پیالی گر گئی۔ اور تم پر بجلی گرتی تو اچھا تھا۔ فہمیدہ کی ممی نے زور دے کر کہا۔
آگئیں — لاٹ صاحب!!
"دن بھر تو —! نوشین کی ممی نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور واپس جا کر مسہری پر لیٹ گئی۔
نوشین نے جب ممی کا یہ ادھورا جملہ سنا تو اس کے تن بدن میں چیونٹیاں سی کاٹنے لگیں۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سے بچھوؤں نے ایک ساتھ اپنے ڈنگ اس کے دماغ میں چبھو دیئے۔ اسے اپنا وجود دنیا پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہونے لگا۔
بار بار وہ ادھورا فقرہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا — تھا۔

اس کا احساس اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ کم از کم ممی کو میرے متعلق یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے ——— !!

نوشین نے اپنے دل کو ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ ممی ایسا نہیں سوچ سکتیں۔ اور پھر وہی تو ایک میری ہمدرد ہیں۔ دن بھر کی تھکی ہاری جب گھر واپس آتی ہوں تو انہی کی گود سکون بخشتی ہے۔ انکی ہمت ان کا حوصلہ ہی مجھے غمِ روزگار سے مقابلہ کرنے کی قوت دیتا ہے وہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ تو خود مظلوم ہیں۔ پھر جب اُس نے اپنی پلکیں اُوپر اٹھائیں تو ان میں اشک موتیوں کی طرح جھلمل کر رہے تھے۔ اس نے سامنے میز پر اپنی سجی ہوئی تصویر کو دیکھا۔ تو اُسے دھچکا سا لگا۔ اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اب نوشین کو عمر کے ساتھ ساتھ اپنی تنہائی کا بُری طرح احساس ہوا کیونکہ ممی کی باتیں وہ سُن چکی تھی۔ اور فہمیدہ بھی اسے خاطر میں کم ہی لاتی تھی۔ ابا جان کو دن بھر دوستوں سے فُرصت ہی کب ملتی تھی۔ رات کو لیٹ گھر آتے۔ اور پھر گھر یوں لگتا جیسے بھونچال کی زد میں ہو۔ ابا جان کو تو کھانے کو چاہیئے۔ اور پہننے کو عمدہ لباس یہ اور سب ان کی لاڈلی بیٹی نوشین مہیا کرے۔ اگر ناشتے میں کمی بیشی ہو جائے تو سب گھر والوں کو وہ ڈانٹ ڈپٹ سُننا پڑتی ہے کہ ——— الاماں ان ہی پر کیا موقوف بھائیوں کو اچھا لباس، کالج کی فیس، کتابیں کاپیوں کا خرچ اگر نہ ملے تو باجی کی شامت۔ بہنوں کو معیاری زندگی گزارنے کے لیے فیشن کے

مُطابق لباس مہیا نہ ہو تو جینے کب دیں،
اللہ اکیلی جان ——— کیا کروں۔ عورت ذات ہر طرف ہوس کے
بُھتنے ناچ رہے ہیں اور گھر میں میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے ———
اُف میرے خدا انہی باتوں کو سوچتے ہوئے اسے یاد ہی نہ رہا
کہ فہمیدہ نے کب چائے میز پر رکھی۔
فہمیدہ جب ناول اٹھانے کے لیے دوبارہ آئی تو اس نے دیکھا کہ نوشین
کے سامنے تپائی پر چائے کی پیالی ویسے کی ویسے پڑی ہے۔ اس پر
فہمیدہ نے کہا۔
نوشی باجی!! ——————— کیا سوچ رہی ہو؟
چائے تو برف ہو رہی ہے۔
" نوشی باجی!! ——— آخر تم کس سوچ میں ڈوبی رہتی ہو۔ کیا ہو گیا
ہے تمہیں ——— ؟ فہمیدہ نے نوشین کے دل کی بات کریدنے کی
کوشش کی۔
فہمیدہ!! ——— میری تو سنو کہ اپنی ہی کہے جاؤ گی"۔ نوشین نے
ذرا رُعب دیتے ہوئے کہا۔ ہاں کہو ——— کیا حکم ہے سرکار
دیکھو! عامر کہاں ہے؟
کیا وہ کالج گیا تھا؟
نہیں باجی!! عامر بھر آج کالج نہیں گیا تھا۔ سارا دن اپنے کمرے میں ہی
لیٹا رہا ہے۔ فہمیدہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

عامر کہتا ہے کالج کی فیس تو ملتی نہیں میں کالج نہیں جاؤں گا۔ مجھے ہر روز شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔

فہمیدہ جب یہ کہہ رہی تھی۔ عامر کمرے میں داخل ہوا۔

نوشی باجی ——— میرا ذکر خیر ہو رہا ہے۔؟

دیکھو!! عامر تم پھر آج کالج نہیں گئے!

باجی کیا کرتا۔ تم خود بھی تو سوچو! تقریباً دو ماہ کی فیس چاہیئے۔ عامر نے شرمندہ سا ہو کر کہا۔ نوشی باجی میں تو کہتا ہوں۔ ———

کیا کہتے ہو؟ نوشین نے ذرا ترش لہجے میں اس کی بات اُچکتے ہوئے پوچھا۔

یہی کہ ——— ڈیڈی بالکل نہیں چاہتے کہ میں کالج میں پڑھوں۔ میں نے تو فیصلہ کیا ہے کہ کالج چھوڑ دوں گا۔ عامر نے یہ سب تیزی سے کہا اور دوسری جانب جانے لگا۔

عامر! ——— بے وقوف مت بنو۔

میں ابھی زندہ ہوں تم اپنی تعلیم جاری رکھو۔ نوشین نے بڑے اعتماد سے کہا اور پھر پرس سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر عامر کی طرف بڑھا دیا۔

دیکھو! عامر کل کالج جا کر تمام واجبات ادا کر کے محنت سے پڑھو۔ دل لگا کر کام کرو۔ اسی میں عزت ہے۔

نوشین نے نصیحت کی۔ فیس اور دُوسرے اخراجات کے سلسلہ میں آئندہ

تمہیں شرمندگی نہ ہو گی۔
جب عامر چلا گیا۔ تو اس نے چاہا کہ لباس تبدیل کرے۔ کہ اتنے میں
عفت نے اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔
باجی!! ——— باجی!!
مجھے وہ والی گڑیا دلوا دو نا ——— دیکھیں آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔
عفی ——— کون سی گڑیا؟ نوشین نے اس کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے
پوچھا۔
وہی باجی! ——— جو بازار میں دیکھی تھی۔ اگر آپ کے ساتھ اس روز
ایاز بھائی نہ ہوتے تو اس روز ہی آپ سے کہتی کہ وہ پیاری سی
گڑیا لے کر دو۔
عفت نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔
عفی تم بہت شریر ہو۔ تم تو خود گڑیا ہو تمہیں گڑیا کی کیا ضرورت ہے؟
نوشین نے عفی کے گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
باجی!! باتوں میں نہ ٹالیں۔ ہم تو گڑیا لیں گے۔ عفت نے ضد کرتے
ہوئے کہا۔
اچھا ——— عفی! نوشین نے اسے تسلّی دی۔
یہ سب کیا ہے؟ ——— نوشی بیٹی!
عفی کیا ضد کر رہی ہے؟ خان صاحب نے گھر میں داخل ہوتے
ہوئے کہا۔

نوشی با جی ——— ابو آ گئے ۔

اتنے میں خاں صاحب نوشین کے قریب آکر کھڑے ہو گئے ۔

نوشی بیٹیا! وہ تمہارے ایئر ہوسٹیس والے انٹرویو کا کیا بنا ۔؟

جی ابا جان!

میرا خیال ہے کام بن جائے گا ۔ نوشین نے جواب دیا ۔

نوشی! تم جانتی ہو ۔ زمانہ کیسا ہے ۔ آج کل تو رشوت کا دور ہے یا پھر کوئی بڑی سی سفارش ہونا چاہیئے اس کے علاوہ تو جوتیاں ہی چٹخانا پڑتی ہیں ۔ جدھر جاؤ "NO VACANCY" لکھا نظر آتا ہے ۔ خاں صاحب نے بڑی شفقت سے سمجھاتے ہوئے کہا ۔

ابا جان! ——— آپ کی بات صحیح ہے ۔ نوشین نے ادب سے خانصاحب کی بات کی تائید کی ۔

لیکن!! ——— ابا جان ایاز صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے ۔ وہ بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں ۔ ان کی جان پہچان بڑے بڑے با اثر لوگوں سے ہے ۔ ایاز صاحب میرے لیے بہت کوشش کر رہے ہیں ۔ کل انٹرویو تھا ۔ وہ سارا دن میرے ساتھ رہے اور واپسی پر مجھے اپنی کار میں ہی گھر چھوڑ گئے تھے ۔ ابا جان! ——— ایاز صاحب بہت اچھے انسان ہیں ۔ نوشین نے سر جھکاتے ہوئے بہت کچھ کہہ ڈالا ۔

نوشی بیٹیا! ——— ایاز کا یہ بہت بڑا احسان ہے ۔ خاں صاحب نے کہا ۔

اچھا نوشی!! ——— اللہ کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔ میں تو بہت تھکا ہوا ہوں — چلتا ہوں — ذرا لیٹ کر آرام کروں۔ یہ کہہ کر خانصاحب اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔

شکریہ ——— ابّا جان!

خان صاحب کے جانے کے بعد نوشین بھی لباس تبدیل کرنے کے لیے سائیڈ کرٹن کے پیچھے چلی گئی۔ جب وہ لباس تبدیل کر رہی تھی تو اسے اپنے جسم کا سایہ دیوار پر گھٹتا بڑھتا دکھائی دیا۔ سائے کو دیکھ کر وہ سوچنے لگی۔ وقت بھی کیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وقت نے اُسے کیا بنا دیا ہے اُسے اپنا بچپن، والدین کے چاؤ چونچلیں ناز نخرے اپنی ضدیں۔ شدّت سے یاد آ کر بے چین کرنے لگیں ——— آہ! ——— اب وہ بھی ——— تو ڈھلتے سایوں کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سوچ کر اس کے سراپے نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس نے بریزر کے بکل کو کھول کر جسم سے الگ کر کے بلاؤز کے قریب رکھ دیا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑی رہی۔ تب اس کو احساس ہوا کہ اس کا کندن سا جسم ننگا ہے سینے پر لمبی سیاہ زُلفیں کھیل رہی تھیں ان کو جھٹک کر نوشین نے شانوں پر ڈالا۔ اور جلدی سے ہلکے پیازی رنگ کا ریشمی پاجامہ اس سے مناسبت رکھتے ہوئے اسی رنگ کا کُرتہ پہن کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اور پلنگ پر لیٹ کر آرام کرنے لگی۔

نوشین نے سونے کی بہت کوشش کی۔ لیکن نیند شاید اس

سے روٹھ گئی تھی ۔لاکھ آنکھیں بند کرتی ــــ لیکن ایک انجانی سی خواہش سے اس کی آنکھیں پھر کھل جاتیں اور وہ مسلسل سوچنے لگ جاتی، اس کی سوچ کیا تھی۔ بس ایک ہی خیال اس کے ذہن پر مسلط تھا، اور وہ ایاز کے متعلق خیال تھا، جس نے ہر مصیبت میں اس کی ہمت بڑھائی، خاندان والوں کے طعنے سُنے، احباب کی پھبتیوں پر چُپ رہا۔ مگر اس کی مدد کی، جبکہ باپ نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اور بڑا بھائی بھی اپنی دُلہن کو لے کر الگ جا بسا۔ ماں کی دیکھ بھال۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی تربیت ان کے تعلیمی اخراجات کی ذمّہ داری بھی اسی پر آپڑی۔ اگر وہ فرشتہ رحمت بن کر نہ آتا تو آج اس خاندان کا کیا حشر ہوتا۔ اب اس کے احسان کا بدلہ کیسے چکائے۔ اس نے سوچا کیوں نہ اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنالے۔ لیکن ایاز نے کبھی اس کا اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ عجیب بے غرض آدمی ہے۔ ایاز ابھی تک معمّہ ہے ــــ ایسا خاموش جس سے کبھی کبھی اُلجھن بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ نوشین کی سوچ مختلف دائروں میں بکھرنے لگی۔ پھر نوشین کو اپنی سہیلی کے کہے ہوئے وہ الفاظ یاد آنے لگے۔ نوشی کل تمہیں ایاز کی کار میں بیٹھا دیکھا تھا۔ بہت خوب جوڑا لگتا تھا۔ کیا اچھا ہو تم ــــ اس کی سہیلی نے نوشین کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔ اور پھر نوشین کو ایاز کے اس بے تکلف دوست کی باتیں بھی یاد آنے لگیں۔

ایاز یار! بھابی تو بہت سویٹ ہیں کبھی ان کو لے کر ہمارے گھر بھی آجانا۔ یار تم بھی عجیب ہو۔ ہمیں شادی کی خبر تک نہ کی۔ آخر ایسی کون سی جلدی تھی؟ یا مجبوری۔

اور پھر جب ایک روز ایاز اُسے گھر کے قریب اُتار کر واپس جا رہا تھا۔ تو نکڑ پر سگریٹ والے بابا رنگو نے کہا تھا۔

یہ لونڈیا بھی اب کام سے گئی۔ شاید وہ [redacted] کسی گاہک سے میرے متعلق کہہ رہا تھا۔

دیکھو بھائی!! یہ جو کار میں تھا۔ شادی شدہ ہے۔ بال بچوں والا ہے اب اس خوبصورت لونڈیا کو چکر دے رہا ہے۔

نوشین یہ سوچتے سوچتے عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ ایاز شادی شدہ ہے۔ ایاز نے پہلی ہی ملاقات میں بتا دیا تھا۔ کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ مگر اس کی بیوی فالج کی وجہ سے اپاہج ہو گئی ہے۔ اب گھر کا سب کام کاج اسے ہی کرنا پڑتا ہے۔ اور اپاہج بیوی کی دیکھ بھال بھی اس کے ذمہ ہے۔ یہ سُن کر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

نوشین کافی دیر گہری فکر کے گرداب میں پھنسی رہی۔

آخر نوشین نے فیصلہ کیا کچھ بھی ہو —— لوگ کچھ بھی کہیں۔ ایاز ایک اچھا انسان ہے ——————

اس کے سینے میں درد بھرا دل ہے۔ وہ ایک اپاہج بیوی کا سہارا

ہے۔ اور آج اس کو بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ ایاز کا
سہارا میں بنوں گی۔ پھر میں اور ایاز ابا رہج بیوی کو بیساکھیوں
کی طرح سہارا دیں گے۔ جب وہ اس سوچ سے باہر آئی تو
اس کے چہرہ پر اطمینان کی شفق پھیل رہی تھی۔

صبیحہ رحمٰن

"دوپہر کا خواب"

"زلفی"!

آج پھر تم نے دیر لگا دی۔

میں تو انتظار کرتے کرتے چور ہو گئی ہوں۔ تم بہت کٹھور ہو، تم کیا جانو؟ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ دل رکھتے ہیں، ہمارے بھی کچھ جذبات ہیں۔ ٹھیس لگے تو احساس کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ آزمائش کی حد ہوتی ہے۔ تم چاہتے کیا ہو؟ یقین کرو۔ اور کچھ جاننے کی کوشش کیا کرو۔ فاخرہ نے ایک ہی سانس میں زلفی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

فاخی!!

جناب کی تقریر ختم ہو گئی کیا؟

کچھ مزید —— ارشاد آپ تو اچھی خاصی مقررہ ہیں۔ زلفی نے فاخی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے زلفی کو کچھ احساس ہوا کہیں اس نے زیادتی تو نہیں کی۔ آخر فاخرہ کوئی پرائی نہیں۔ میری کزن ہے۔ اتنے میں وہ بوٹ اُتار کر پلنگ پر آرام کے لیے لیٹ گیا۔ اور خاموش نگاہوں سے دیوار پر اپنے والد مرحوم کی تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا۔

اس کے قریب پڑی ایک کُرسی پر فاخرہ بیٹھی اس سے کچھ پوچھنے کے موڈ میں تھی اس سے پہلے فاخی زلفی سے کچھ پوچھتی۔ زلفی نے فاخرہ سے سوال کر ڈالا۔

فاخرہ تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس طرح کے سوال کیوں کرتی ہو؟ وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت سے پہلے میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتا۔ نہ جانے حالات کیا سے کیا ہو جائیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو میرے مستقبل کا ہی خیال کرو۔ فاخرہ کے جذبات کیا ہیں۔ یہ تو برساتی نالے کے بہاؤ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی تھوڑے سے وقت کے لیے شور کے سوا کچھ حیثیت نہیں ہوتی۔ خدا جانے تمہاری طبیعت میں جلد بازی کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ عجلت میں کبھی کبھار اپنے بنائے کام خراب ہو جاتے ہیں۔

اگر تم اپنی اس ضد کے ہاتھوں معمولی سی بھی غلطی کر بیٹھیں تو زندگی بھر پچھتاؤ گی۔

کیا سمجھیں ؟ خاک !! میں تو سب تمہارے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ جہاں تک فیصلہ کا تعلق ہے۔ یہ کام بہر حال آسان نہیں۔ اس معاملہ میں نہایت غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔ فیصلے روز نہیں ہوا کرتے۔

کیا جھگڑا ہو رہا ہے۔ ہم بھی تو کچھ جانیں۔ فاخرہ کے ڈیڈی نے کمرے میں داخل ہوتے پوچھا۔

ڈیڈی ! کچھ نہیں۔

وہی زلفی سے بات کر رہی ہوں۔ فاخرہ نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

دیکھیئے !! ڈیڈی !!

زلفی کو سمجھایئے —— اس نے کل مجھے بہت بور کیا ہے۔ میری سہیلیاں کیا سوچتی ہوں گی۔ ان کے ہاں دعوت پر جانا تھا۔ ان میں سے دو چار نے اس کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ میں نے کہا تھا وہ میرے ساتھ ضرور آئے گا۔ لیکن میں ان صاحب کی منتظر ہی رہی ان کو نہ آنا تھا نہ آئے اور پھر مزید یہ زیادتی کی جب دیر سے آئے تو تاخیر کی معذرت تک نہ کی۔ فاخرہ نے شکایتی انداز میں ڈیڈی سے سب کچھ کہہ دیا۔

انکل آپ کو پتہ ہے ہمارے امتحان قریب ہیں۔ اگر اس وقت بھی نہ پڑھا تو ریزلٹ تو ظاہر ہے۔

ہاں! فاخی! زلفی ٹھیک کہتا ہے تم لوگوں کو زیادہ محنت کرنا چاہیے۔
ایسی بھی کیا محنت؟

ڈیڈی زلفی کا کیا ہے اسے تو صرف ایک ہی دھن ہے۔ کتابیں پڑھنا۔ زیادہ سے زیادہ وقت کے لیے ٹھنڈی روم میں گھسے رہنا۔ یہ تو کتابوں کا کیڑا ہے! کیڑا!!

اگر اس طرح آدمی ڈاکٹر بن سکتا ہے تو ہم باز آئے ایسی ڈاکٹری سے نہ دنیا کی خبر اور نہ اپنے دل کی۔ فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے فاخرہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

دوسرے روز فاخرہ کالج میں زلفی سے سارا دن نہ بولی اور زیادہ وقت اس نے نومی کے ساتھ گزارا۔ آج تو اس نے نومی کے ساتھ بیٹھ کر کیفیٹریا میں چائے بھی پی اور پھر چند دن میں ہی نومی اور فاخرہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتے چلے گئے۔

اس دوران فاخرہ نے زلفی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار اگر چائے پر کوئی بات ہو جاتی تو اس کا وہ ہاں ہاں ہوں!! میں جواب دے دیتی۔

زلفی اس لحاظ سے تو خوش تھا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے کا وقت مل جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ سوچنے لگتا اور بہت سے خیال اس کے ذہن کے پردہ پر بکھرنے لگتے اور وہ سر جھٹک کر پھر میڈیکل کا بھاری بھرکم کتابوں میں گم ہو جاتا۔ زلفی نومی کو جانتا

تھا کہ وہ کس کردار کا ہے۔ زلفی کے ذہن میں خدشے پلنے لگے۔
کیونکہ نومی اور فاخرہ کالج سے باہر بھی ایک دوسرے کو ملنے لگے
اور چند دن ہوئے نومی نے اس کو ایک ساڑھی لے کر دی تھی تو
وہ اکثر پہنتی تھی۔ زلفی کو تعجب تھا کہ فاخرہ میں اس قدر تبدیلی کہیں
رنگ نہ لائے۔ زلفی اپنے کمرے میں کتاب کے پڑھنے میں مگن تھا
کہ گیلری میں سے گزرتے ہوئے فاخرہ کے گنگنانے کی آواز اس
کے کان پر پڑی وہ چونک پڑا

فاخرہ آج اتنی جلدی کالج جا رہی ہو۔

ہاں!!

کیا اتنی جلدی سی کالج نہیں جانا چاہیئے۔

فاخرہ بُرا مان گئی کیا؟ میں نے تو یہی پوچھا ہے۔

اوہو! خوب!!

زلفی تم نے کیا اچھے موقعہ پر یاد کرایا ہے۔ میں تو تمہیں بتانا
ہی بھول گئی تھی کہ آج میں اور نومی دونوں پکنک پر جا رہے ہیں۔
میں نے ڈیڈی سے اجازت لے لی ہے۔ بہت مزہ آئے گا۔ مچھلی کا
شکار بھی ہوگا۔ اور سیر بھی

پھر اچانک فاخرہ کو کچھ خیال آیا اور وہ ہینڈ بیگ کھڑکی کے پاس
پڑی تپائی پر رکھ کر ڈرائینگ روم میں گئی اور واپسی پر شاید وہ
پکنک اور نومی کے تصور میں اتنی خوش تھی کہ وہ ہینڈ بیگ آج

ساتھ لے جانا بھول گئی تھی ۔

اس دن زلفی کا کتابوں میں دل نہ لگا۔ سارا دن کھویا کھویا سارہا آج اسے محرومی کا احساس ہو رہا تھا۔ شام تک وہ ادھر اُدھر پریشان سا پھرتا رہا۔ چائے پر فاخرہ کے ڈیڈی نے بھی زلفی سے کچھ باتیں کرنی چاہیں لیکن وہ صرف انکل ہاں اور جی ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ کہ اتنے میں فاخرہ گیٹ سے اندر داخل ہوتی دکھائی دی۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

فاخرہ بیٹی آؤ چائے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ڈیڈی میں بہت تھکی ہوئی ہوں آرام کرنا چاہتی ہوں ۔

اخرہ کے جسم کا انگ انگ درد اور تھکن سے چور چور تھا اور اس ی آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں ۔

نومی کتنا اچھا ہے۔ نومی سویٹ ہے اور وہ مجھے بہت اچھا تا ہے۔ لیکن شریر ہے۔ آج میں کہتی ہی رہی کہ میرا ہینڈ بیگ گھر ہ گیا ہے ۔ پھر بھی وہ کہاں ماننے والا تھا۔ آج بہت زیادتی کی ہے ومی نے لیکن اس میں نومی کا کیا قصور ہے۔ اس نے تو مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ دوسرے روز فاخرہ بہت دیر سے اُٹھی۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی سرخی بکھری ہوئی تھی ۔

زلفی !! کالج جا رہے ہو۔ فاخرہ نے لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

ہ خیریت ہے ۔ بس زلفی کچھ بدن دُکھتا ہے ۔

ہاں! نزہت کو کہنا کہ میں آج ذرا دیر سے آؤں گی۔
زلفی نے اس کی بات کا نوٹس نہ لیا۔ اور گیلری سے پار گزر گیا۔
گیٹ کے قریب اسے فاخرہ کی آواز سُنائی دی۔ وہ شاید چندا کو
ڈانٹ رہی تھی۔ کہ تم نے ابھی تک میرے لیے گرم پانی بھی باتھ رُوم
میں نہیں رکھا۔
فاخرہ بی بی پانی وغیرہ رکھ دیا ہے۔
فاخرہ نے باتھ روم میں داخل ہو کر کپڑے اُتارے تو اس کو جھُرجھری
سی محسوس ہوئی۔ اور پھر جب اس نے اپنے جسم پر گرم پانی سے بھرا
ہوا مگا ڈالا تو مجھے ایک گونا سکون سا محسوس ہوا۔ آج وہ کافی دیر
تک باتھ روم میں اپنے آپ کو دیکھتی رہی اور کچھ محسوس کرتی رہی۔
اگلے روز جب فاخرہ کالج گئی تو نومی نے اُسے راستے میں ہی روک
کر خیریت دریافت کی۔
فاخرہ سویٹ کیسی ہو۔
نومی! اس روز سے کچھ طبیعت بوجھل سی ہے۔
خیر تم ہو؟
تمھارے ہوتے ہوئے ہمیں کیا پڑی جو غم کھائیں۔
ہاں! فاخرہ مجھے مبارک باد کہو!!
نومی کیسی مبارک باد اور کس بات کی؟
فاخرہ میرا پاسپورٹ کے علاوہ ویزا بھی آگیا ہے۔ میں تو پڑھائی

درمیان میں ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ سوچ رہا ہوں تم یاد آؤ گی تو پھر کیا کروں گا۔

نومی خط لکھ دیا کرنا اور تصویر سے دل بہلا لینا۔

ہاں!! فاخرہ تم بھی مجھے ضرور خط لکھنا دیکھنا بھول مت جانا گھر سے دور تمہاری تصویر ہی میرا دل بہلا سکے گی۔ نومی کیسی باتیں کرتے ہو؟

فاخرہ تمہیں کیسے بھول سکتی ہے۔ نومی دیکھو کل مجھے ضرور ملنے میرے گھر آنا۔ آؤ گے نا میں تمہارا انتظار کروں گی تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔

فاخرہ دوسرے روز شام کو نومی کا انتظار کرتی رہی لیکن رات تک وہ نہ آیا۔ نہ جانے نومی کیوں نہیں آیا۔ کل مل جائے تو میں اس سے اس بے رُخی کا بدلہ لوں گی۔

دوسرے روز کالج کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس کی ایک سہیلی نے بتایا کہ سُنا ہے نومی بیرون ملک چلا گیا ہے۔ کل شام چند لڑکیوں کو اس نے کیفے میں چائے کی دعوت دی تھی اور رات کی فلائٹ سے لندن روانہ ہو گیا ہے۔

فاخرہ پر یہ سُنکر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس نے چلنا چاہا مگر قدم منوں بھاری تھے۔ وہ اداس اداس کاریڈور سے گزر کر لائبریری کے ہال میں ایک کونے میں لگی میز پر کسی انگلش رسالے میں رنگین اشتہار دیکھنے میں محو ہو گئی۔

فاخرہ! فاخرہ!!

زلفی نے لائبریری میں داخل ہوتے ہوئے آواز دی۔

لیکن زلفی کی آواز سُنکر بھی فاخرہ نے جواب نہ دیا۔

اتنے میں زلفی نے قریب آکر کہا۔

فاخرہ تم مجھ سے ناراض ہو۔

تم بتاؤ کیوں چُپ چپ رہتی ہو۔ تمہیں کیا دُکھ ہے۔

زلفی!

میں ایک بات کہوں تو کیا مان جاؤ گے

آخر تمہیں دکھ کیا ہے؟ بتاؤ تو سہی۔

زلفی ——— دُکھ ———!

اگر تم چاہو تو میرا دُکھ بانٹ بھی سکتے ہو؟

فاخرہ کیا مطلب ———؟

میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکا۔ اگر تم میری بات نہیں سمجھ سکے تو اس قدر ہمدردی جتانے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔

پھر تم چاہتی کیا ہو؟

زلفی میں!! شادی کرنا چاہتی ہوں۔

فاخرہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟

وقت آئے گا تو سب ہو جائے گا۔ یہ باتیں بزرگوں کے سوچنے کی ہوتی ہیں۔

نہیں زلفی تم میری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔
زلفی یہ سُنکر کچھ سوچنے لگا۔
کیا سوچ رہے ہو؟
فاخرہ کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟
بتاؤ میں آنٹی سے کہہ کر تمھاری پسند کی شادی کرانے میں مدد کروں گا۔
زُلفی میں کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔
تو پھر زلفی ڈیئر کچھ جاننے کی کوشش کرو۔
میں تم سے شادی کی التجا کرتی ہوں۔
زلفی میں تمہاری ایک ہی کزن ہوں مجھ سے شادی کر لو۔
میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔
زلفی میں خواب دیکھنے کی عادی ہو گئی ہوں۔ دوپہر کو تو میں اکثر نہایت بھیانک خواب دیکھتی ہوں۔ دوپہر کے خواب جھوٹے ہوتے ہیں فاخرہ!
زُلفی نے فوراً کہہ دیا۔
اگلے روز جب زُلفی نے چائے کی میز پر فاخرہ کی طرف نظر ڈالی۔ تو نہایت مایوس نگاہوں سے زلفی کو التجا کر رہی تھی کہ کل والی بات کے متعلق تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔
زلفی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا تو اس نے پھر فاخرہ کی طرف دیکھا

اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر اسے احساس ہوا اور وہ انٹی کو بمشکل کہہ سکا۔ انٹی میں چاہتا ہوں کہ آپ ۔ ۔ ۔ ۔

زلفی بیٹے کہو کیا کہنا چاہتے ہو ـــــ رک کیوں گئے ۔

انٹی دیکھئے نا ـــــ کیا دیکھئے جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔

فاخرہ پلیز!!

فاخرہ بیٹی تم ذرا اندر چلی جاؤ ـــــ فاخرہ جب چلی گئی تو اس نے کہا۔ انٹی میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

بیٹا تم اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ اب تمہارا آخری سال ہی تو ہے۔

ڈاکٹر بن جاؤ گے تو تمہاری شادی بڑی دھوم دھام سے فاخرہ سے کروں گی۔

انٹی ٹھیک ہے۔ لیکن شادی تو اب بھی ہو سکتی ہے۔

میں تعلیم پوری کر لوں گا ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر تو بن ہی گیا ہوں!

بیٹا ٹھیک ہے۔ لیکن فاخرہ سے بھی پوچھ لوں شام فاخرہ سے جب اس کی امی نے پوچھا تو اس نے اثبات سے سر ہلا دیا۔

ماں سوچ رہی تھی۔ بیٹی بھی راضی ہے اور داماد بھی نہایت ذہین مل رہا ہے اور پھر ہم نے خود ہی اسے پڑھا لکھا کر اس قابل کیا ہے کیوں نہ اپنی بیٹی فاخرہ ہی ایک ڈاکٹر کی بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔

فاخرہ اور زلفی خوش رہنے لگے۔

فاخرہ کو زلفی چھیڑتے ہوئے کہتا کہ تمہاری جلدی رنگ لائی ہے۔

زلفی !!

تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ شادی تمہاری زندگی میں رکاوٹ تو نہیں بنے گی میں تمہارا احسان کبھی نہیں بولوں گی۔

فاخرہ کیا مطلب۔ زلفی نے اچانک چونک کر پوچھا۔

بس یہی کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے پر راضی ہو گئے۔

راضی !! اس میں تو میری خود مرضی تھی۔ میں تو صرف چاہتا تھا کہ تعلیم مکمل کر لوں پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چلو اب تو شادی میں بھی چند دن باقی ہیں۔

شادی خانہ آبادی —— آئندہ ماہ ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں گے۔

چند دن کی چھٹی کے بعد جب زلفی کالج میں داخل ہوا تو اِدھر اُدھر لڑکیاں لڑکے کھسر پھسر کرتے ہوئے اُسے ملے۔

لیبارٹری کی کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کو فاخرہ کی سہیلیوں کی باتوں کی آواز سُنائی دی۔

جو ایک دوسرے سے کہہ رہی تھی۔

یہ فاخرہ بڑی چالاک نکلی —— دیکھو تو می سے —— چھوڑو، کوئی سُنتا نہ ہو۔ یہ لڑکے موئے دیواروں سے کان لگائے رہتے ہیں۔ زلفی تو سیدھا ہے اِسے کیا پتہ کہ فاخرہ کس حالت میں ہے۔

ہائے ہائے نگوڑی کو شرم بھی نہیں آئی ۔

یہ سب سُن کر زلفی نے سر جھٹک دیا۔

لڑکیاں ایک دوسرے سے حسد کرتی ہیں ۔

سُنی سُنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیئے ۔

شادی ہوگئی اسی طرح خوشی و مسرت کے دن گزرنے چلے گئے۔ فاخرہ اب زیادہ وقت اس کے ساتھ سیر وغیرہ نہ کرتی بس گھر میں ہی باغ میں دو لوں لیٹے اور چلتے ہوئے اپنی زندگی میں ہونے والی تبدیلی کے متعلق سوچتے رہتے اور وہ دن بھی آیا جب دو سے تین ہونے کی باری آئی ۔

اچانک نرس نے آکر بتایا کہ زلفی کا بیٹا ہوا ہے اور نرس بجلی کی سی تیزی سے آگے نکل گئی۔ اتنے میں وہ خود فاخرہ کے کمرے میں جانے کے لیے مڑا کہ ڈاکٹر رضیہ نے کہا۔ افسوس ڈاکٹر زلفی تمہاری بیگم جان بر نہ ہو سکی ۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کاغذ کا پرزا زلفی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لپک کر کاغذ مس رضیہ کے ہاتھ سے لے لیا۔

اس خط میں لکھا تھا۔

ڈیئر جانی زلفی ! ..... معاف کرنا میں تمہارا ساتھ نہ دے سکی۔ گنہگار تھی یہ بچہ معصوم ہے ۔ اس کو کیا پتہ ۔ نومی کون ہے ۔ یہ تو صرف زلفی کو دیکھے گا۔ زلفی جو اس کا باپ بنے گا۔ لوگ اسے ڈاکٹر زلفی کا

بیٹا کھیلیں گے۔ زلفی اگر تم ناراض بھی ہو جاؤ تو میں تمہیں روکوں گی
نہیں۔ تم ڈاکٹر ہو۔ یہ بیٹا ہے۔ اگر بیمار ہو جائے تو اس لوتھڑے سے
چھٹکارا حاصل کرنا تمھارے لیے مشکل نہ ہوگا۔ تمہاری فاخی۔
زلفی نے اپنے اندر ایک عجیب کرب محسوس کیا۔
فاخرہ ! ــــــ میں ڈاکٹر ہوں میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کچھ بھی ہو میں
اسے احساس نہیں ہونے دوں گا۔
سر! آپ کو ڈاکٹر امتیاز نے اپریشن میں معاون کی حیثیت سے
بلایا ہے۔
ایک اسسٹنٹ نے آکر کہا۔ اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔
جب زلفی اپریشن تھیٹر میں داخل ہوا تو ڈاکٹر امتیاز اپریشن
کے لیے تیاری کر رہا تھا۔
اس نے زلفی سے کہا۔ ڈاکٹر مریض کو ضرورت کے مطابق
بلڈ انجیکٹ کر دہا
جب زلفی نے جان بلب مریض کو خون دینے کے لیے نیڈل
اس کے جسم کی رگ میں چبھوئی تو اسے احساس ہوا کہ خون بھی
کیا قیمتی چیز ہے۔ ساری دنیا کے انسانوں کے خون کو جمع کر کے
دیکھو اور اس کا رنگ سرخ ہو گیا
آہ!
اپریشن مکمل کر کے واپسی پر اس نے فاخرہ کے خالی بیڈ کے

قریب بچے کو ایک نرس کے ہاتھوں میں دیکھا اور قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نہ جانے دل ہی دِل میں کیا فیصلہ کیا کہ آگے بڑھ کر اس معصوم سے پھول کی طرح شاداب چہرے کا منہ چُوم لیا۔

صبیحہ رحمٰن

"عکس چلتے ہیں"

خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے!!

تو نے ہم جیسے گنہگاروں کی دعاؤں کو قبول فرمایا ہمیں کتنا خوبصورت اور اچھے محلے میں مکان ملا ہے۔ اڑوس پڑوس میں کتنے اچھے لوگ رہتے ہیں۔

طارق کتنا اچھا لڑکا ہے بغیر کسی جان پہچان ہمیں سامان کے رکھنے میں مدد دی۔ خدا اُسے ہمیشہ تندرست رکھے، کسی نیک والدین کا چشم و چراغ ہے۔

ناظرہ مصلے پر بیٹھی نماز ادا کرنے کے بعد دُعا مانگ رہی تھی۔ اور خدا

کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کے کانوں میں سبزی والے کی آواز پڑی۔ دُعا ختم کرنیکے بعد وہ جلدی سے ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھی۔ طارق جو گلی سے گزر رہا تھا۔ ناظرہ کو دروازے پر ٹوکری لئے کھڑا دیکھ کر پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

لاؤ !! خالہ جان میں سبزی لا دیتا ہوں۔

سبزی والا آگے جا چکا تھا۔ اس نے اسں کو آواز دی اتنے میں ناظرہ نے مسکراتے ہوئے ٹوکری اور پیسے طارق کو دیئے اور وہ سبزی لینے چلا گیا۔ ناظرہ اس کی فرما برداری پر خوش ہو کر دعائیں دینے لگی۔ اس نے سبزی ناظرہ کو دی اور خود چلا گیا۔ راستے میں فضل باری سے ملاقات ہوئی وہ اسے پھر واپس اپنے گھر لے آیا۔ فضل باری تو طارق سے پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی دوستی گہری اور مضبوط ہوتی گئی۔

فضل باری کے والدین خان ملک اور ناظرہ طارق کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ نجمہ طارق کو بھائی جان کہہ کر بلاتی۔

اس چھوٹے سے خاندان کو طارق بہت اچھا لگنے لگا۔ اگر کسی دن طارق کسی وجہ سے ان کے گھر نہ جا سکتا تو گھر کے سب لوگ فکر مند ہو جاتے خان ملک فوراً طارق کے گھر اس کی خیریت کی خبر لینے فضل باری کو بھیج دیتے ایک دفعہ یوں ہوا کہ خلاف معمول طارق پورا ایک ہفتہ ان کے گھر نہ جا سکا۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں لاہور چلا گیا تھا۔

جب طارق لاہور سے واپس ہوا تو اس کی ملاقات سعید سے ہو گئی۔
سعید نے طارق کو طنزاً کہا۔

یار!!

تمھاری تو خان ملک صاحب کے گھر کوئی قدر نہیں۔

بس ویسے ہی فضل باری کی محبت اور اس کے گھر والوں کی چاہت کا ڈھونڈا پیٹتے ہو۔ کہ تم نہ جاؤ تو وہ تمہیں گھر بلانے کے لیے تمہارے گھر چلے آتے ہیں۔ اور وہ تم سے خفا ہوتے ہیں کہ تم کیوں ان کے گھر نہیں آئے۔

طارق نے غصّے سے کہا۔

سعید!! کیا بکواس کرتے ہو؟

طارق کچھ جذباتی ہو چلا تھا پھر کہنے لگا۔

سعید! ہوش کی بات کرو۔

کوئی بات ہے تو سیدھے انداز میں کہو۔

طارق بھائی ——— ! خفا کیوں ہوتے ہو؟

اگر سُننے کی ہمت ہے تو سُنو!!

ہاں! ہاں!!

سعید تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو۔ صاف صاف کہہ دو یہ پہیلیاں نہ بجھاؤ!

سعید!! ——— تو سُنو خان ملک نے اپنی بیٹی نجمہ کی منگنی خواجہ صاحب کے لڑکے کامران سے کر دی ہے۔ میں تو اس بات پر بہت حیران ہوں کہ خواجہ صاحب کو تو اس محلے میں آئے ہوئے ابھی سال بھی نہیں ہوا اور

نوبت بایں جارسید کہ بات رشتہ ناطے تک پہنچ گئی۔
خان ملک تو طارق تمہیں اپنا بیٹا سمجھتے تھے،
پھر کامران میں ایسی کون سی خوبی ہے۔ جو انہیں پسند آگئی ہے۔ تم نوجوان بھی ہو، اور ماشاءاللہ خوبصورت بھی۔ اس کے علاوہ خان ملک کا ان کے خاندان سے دور کا بھی تعلق نہیں اور اگر ان کا خیال اپنے خاندان سے باہر ہی رشتے کرنے کا تھا تو پھر تم سے زیادہ موزوں داماد اور کوئی نہیں تھا۔
سوسائٹی میں تمہاری عزت ہے۔ محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہو، معقول آمدنی ہے۔ اور اس بات کے ساتھ ساتھ نجمہ بھی تمہیں پسند کرتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے نہ جانے کیا سوچ کر خان ملک صاحب نے اندھیرے میں چھلانگ لگادی ہے۔ خدا جانے انہوں نے خواجہ صاحب کے ہاں کیا دیکھ کر کی ہے۔ کہ سوچے سمجھے بغیر یہ فیصلہ کردیا ہے۔
خواجہ صاحب کا لڑکا کامران تو ابھی زیر تعلیم ہے۔
چھوڑو یار ——— طارق !!
سعید نے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔ کہ لعل تو کوئی لے گیا اور تم بیٹھے خاک چھانو طارق نے جھنجلا کر کہا۔
سعید ! خدا کے لیے یہ قصہ بند کرو۔
میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں اور تم ہو کہ جلتی پر تیل ثابت ہوئے ہو۔
طارق ——— دوست الزام نہ دو۔

میں نے یہ سب کچھ ہمدردی کے طور پر کہا ہے۔
اور تم ہو کہ بُرا مان گئے ہو۔
بس بس !! —— چھوڑو اس گفتگو کو۔
اپنی نصیحت اپنے پاس ہی رکھو۔ میں خود معاملہ سے نمٹ لونگا۔ طارق نے خفا ہوتے ہوئے سعید کو جواب دیا۔
سعید نے پھر طنز کا تیر چلایا اور کہا۔
طارق ہم نے بڑے بڑے عاشق دیکھے ہیں ؟
لیکن طارق نے سعید کی بات سُنی ان سُنی کر دی۔ اور اسی وقت غصّے کے عالم میں خان ملک کے گھر کی طرف چل دیا۔ چند لمحے بعد وہ خان ملک صاحب کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اور دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ٹک ٹک کی آواز سُن کر ناظرہ نے نجمہ کو آواز دی جاؤ دیکھو کون آیا ہے۔ شاید طارق ہوگا۔ نجمہ نے دروازہ کھولا۔
طارق !!
ناظرہ نے طارق کو ڈیوڑھی پر کھڑے دیکھ کر پیار سے پکارا۔
خالہ جان !! آداب ہو۔ جیتے رہو بیٹا۔ ناظرہ نے دعائیں دیں۔
طارق —— اتنے دن کہاں رہے۔ کہیں جاتے ہو تو خبر کر کے جایا کرو۔ کیا تم ہمیں اپنا نہیں سمجھتے۔
نہیں خالہ جان ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس اپنے ہی کسی ضروری کام سے جانا پڑا۔ جلدی میں تھا اس لیے آپ لوگوں کو اطلاع نہ کر سکا۔

معذرت چاہتا ہوں آپ لوگوں کو میری وجہ سے زحمت ہوئی میں
بھی تو آپ لوگوں سے دور نہیں رہ سکتا۔
دیکھئے ابھی ابھی آیا ہوں بس گھر میں اٹیچی رکھی ہے اور سیدھا
ادھر آگیا ہوں۔
نجمہ!! انجمہ!! ——— ناظرہ نے آواز دی۔
آئی امی جان!! ———
جب نجمہ قریب آئی تو ناظرہ نے کہا۔
بیٹی!! وہ سامنے والی الماری سے مٹھائی تو لے آؤ۔
خالہ جان! یہ مٹھائی کس خوشی میں طارق نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔
بس بیٹا!! میں تو بضد تھی کہ تمہارا انتظار کیا جائے لیکن خواجہ صاحب
کو نہ جانے کیا جلدی تھی۔ وہ کسی طور نہ مانے۔ آخر خالہ جان کوئی بات
بھی طارق نے کہا۔
ہی! ہی!! ناظرہ کی ہنسی نہ رک سکی۔
طارق بیٹا!! نجمہ کی منگنی ہو گئی ہے۔ وہ تم نے کامران کو دیکھا ہوگا۔
کامران ہے نا خواجہ صاحب کا لڑکا اس سے!!
آپ خالہ جان کیا کہہ رہی ہیں طارق نے کہا اور نجمہ کو جاتے ہوئے دیکھنے
لگا۔ نجمہ اب برآمدے سے گزر کر بڑے کمرے میں چلی گئی تھی۔
طارق بیٹا!! یہ مٹھائی نجمہ کے سسرال کی طرف سے آئی ہے۔
بڑی خوشی ہوئی طارق نے رسماً کہا۔

اور وہ ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ کہ سعید نے اسے جو کچھ بتایا تھا۔ وہ سچ ہی تھا۔ اور جو کچھ طارق نے سوچ رکھا تھا۔ وہ ایک خواب تھا۔ اس کا پانچ کا محل ایک ہی ٹھوکر میں دھڑام سے گر چکا تھا۔ ناکامی اور اداسی نے طارق کو گھیر لیا۔ جذبات کی شدت میں کہنے لگا۔

"اگر نجمہ میری نہ ہو سکی تو وہ کامران کی بھی نہیں ہونے دے گا۔"

میں خان ملک کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دوں گا۔

طارق کے ذہن میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور وہ جلدی سے اُٹھا اور خالہ جان سے اجازت چاہی۔

ناظرہ نے کہا۔ طارق بیٹا! ابھی ابھی تو آئے ہو۔ ذرا اور تھوڑی دیر کے لیے رُک جاؤ!!

خالہ جان۔ میں ذرا گھر جانا چاہتا ہوں پھر آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

طارق جب دروازے سے باہر نکل کر گھر کی طرف جانے لگا تو سامنے سے آتے ہوئے فضل باری سے ملاقات ہو گئی۔

ہیلو!! —— یار طارق!!

اتنی جلدی جلدی کیوں جا رہے ہو۔ تھوڑی دیر اور رُک گئے ہوتے۔ طارق تمہارا کچھ موڈ آف ہے۔ کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا

ہاں!۔ ہاں!! ٹھیک ہے۔ کوئی اندیشے والی بات نہیں بس ذرا سفر کی تھکان ہے۔

فضل باری باتیں کرتے کرتے طارق کے گھر آ گیا تھا۔ جب طارق نے
دیکھا تو اُسے اچانک کچھ یاد آ گیا اور پوچھنے لگا۔
فضل باری یار!
آج خالہ جان نے بتایا ہے کہ نجمہ کی منگنی کامران سے ہوئی ہے۔
ہاں طارق ٹھیک ہے، جوان بہن ہے۔ آخر کب تک والدین اسے گھر بٹھائے
رکھتے۔ پرسوں خواجہ صاحب آئے۔
طارق نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
فضل باری وہی خواجہ صاحب جو پچھلے سال ناظم آباد سے یہاں آ کر آباد
ہوئے ہیں۔
ہاں ٹھیک ہے۔ طارق بھیا! وہی خواجہ صاحب ہیں۔
فضل باری نے طارق کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔
طارق نے فضل باری سے پوچھا کیا آپ لوگوں کے ان سے پہلے سے مراسم
ہیں۔
کہاں یار —— کسی نے انہیں بتایا کہ ہم دوران تقسیم فیروزپور سے ہجرت
کر کے پاکستان آئے ہیں، اور وہ بھی وہاں سے آئے تھے۔ اس طرح
اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے شناسائی ہو گئی ہے۔
ایک دن خواجہ صاحب آبا جان کے پاس آئے اور انہوں نے اپنی خواہش
کا اظہار کر دیا۔ کہ وہ نجمہ کو کامران کے لیے پسند کرتے ہیں۔ ابو جان نے ان
کی خواہش کو نہیں ٹھکرایا اور حامی بھر لی۔

طارق بھیا! آپ کے خیال میں یہ رشتہ کیسا ہے؟ فضل باری نے پوچھا۔
بھئی یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات اور مشاہدہ کا تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کو میں اپنا اخلاقی فرض بھی خیال کرتا ہوں کہ کچھ حقائق سے آپ کو آگاہ کر دوں۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو صحیح مشورہ دوں گا۔ باقی خیال اپنا اپنا۔ جیسا مناسب سمجھیں ویسا کر لیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ خواجہ صاحب ناظم آباد سے یہاں آئے ہیں۔ وہاں ان کے پڑوس میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ میں کبھی کبھی اسکے پاس جایا کرتا تھا۔ وہاں خواجہ صاحب کے نورِ نظر کامران کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو محلے والوں ہی سے اس کی ذلیل حرکتوں کا قصہ سننے میں آتا ہے۔ اس کی انہیں حرکتوں کی وجہ سے محلے کا کوئی شریف آدمی ان کے ہاں آنے جانے کو پسند نہ کرتا تھا۔ ان سے ہمیشہ اڑوس پڑوس والوں کا لڑائی جھگڑا رہتا تھا۔ کامران بڑے بڑے لڑکوں کی صحبت میں پلنے کا شوق بھی فرماتا ہے۔ راہ چلتی شریف زادیوں پر آوازے کسنا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

اس سے آگے کچھ نہ کہو یار طارق! فضل باری نے روکتے ہوئے کہا۔
طارق نے مزید کہا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ خان ملک اور خالہ جان نے کامران کا انتخاب کر کے سخت غلطی کی ہے۔ اس سے نجمہ زندہ درگور ہو جائے گی۔ یہ تو نجمہ کو جہنم میں جھونکنے والی بات ہے۔ نجمہ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔
بھئی فضل باری میں سچ تو یہی کہوں گا۔ چاہے تم ناراض ہو جاؤ۔ اگر

یقین نہ ہو تو کسی روز میرے ساتھ ناظم آباد چلنا اور وہاں خود اپنے کانوں سے لوگوں کی باتیں سُن لینا۔

طارق کی باتیں سُنکر فضل باری سخت پریشان ہو گیا۔ جلدی جلدی طارق سے فارغ ہو کر گھر آ گیا اور آتے ہی اس نے طارق کی سُنی ہوئی ساری باتیں اپنی امی اور ابا کو بتا دیں۔ چونکہ طارق کا ان لوگوں کو ہر طرح سے اعتبار تھا۔ اس لیے مزید غور کرنے کی انہوں نے زحمت گوارا نہ کی۔ اور منگنی توڑنے کے لیے سوچنے لگے۔ اس فیصلے کے متعلق فضل باری نے طارق کو آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ طارق کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ وہ یہ خوشخبری سعید کو سُنانے کے لیے اس کے گھر گیا۔ سعید کو باہر بلا کر طارق نے یہ سب ماجرا اس کو سُنایا۔ سعید یہ سُنتے ہی قہقہہ مار کر کہنے لگا طارق !! ـــــــ کمال کر دیا یار تو نے

اب تو اور چکر چلنے والا ہے۔ طارق نے سعید سے کہا۔ طارق یار یہ چکر ختم کرو۔ کہیں چکر چلاتے چلاتے خود چکر میں نہ پھنس جانا۔

میرا خیال ہے جس طرح خان ملک کو چکر دیا ہے۔ اس طرح خواجہ صاحب کو بھی چکر دینا چاہیئے تاکہ دونوں اپنی اپنی جگہ بدظن رہیں۔ یہ سُنتے ہی سعید اُچھلا۔

واہ پیارے کیا خوب سوجھی۔!!

پھر تو یہ بات ناممکن ہے کہ رشتہ طے پا جائے۔

اچھا سعید !! ـــــــ خدا حافظ طارق نے اس سے جُدا ہوتے ہوئے کہا

میں اب چلتا ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد طارق خواجہ صاحب کے گھر جا پہنچا اور ان سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے وہ خواجہ صاحب کو اپنے مقصد کی طرف لے آیا اور کہنے لگا۔

خواجہ صاحب!! مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں وقت پر موجود نہ تھا۔ ورنہ میں آپ کو اصل حقیقت حال سے آگاہ کرتا۔

کیا بات ہے؟ طارق بیٹا کہو ـــــ کیا کہنا چاہتے ہو؟

ابھی تیر کمان سے نہیں نکلا۔ بس خواجہ صاحب!!

آپ سے کیا عرض کروں۔ کوئی ایک بات ہو تو کہوں یہاں تو قصہ ہی دیگر ہے۔ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں۔

دفتر کے دفتر کھُلے ہیں۔

میرا ذہن تو خان ملک کے متعلق سُنی اور آنکھوں دیکھی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ باتیں جو خان ملک کی ذلت کا باعث بنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی عزت کی خاطر سمن آباد سے یہاں آئے ہیں۔ سمن آباد میں ان کے پڑوس میں میرے رشتہ دار رہتے ہیں۔ جن کے ہاں میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے خانگی حالات کا بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ خواجہ صاحب میں یہ نہیں چاہتا کہ بھائی کامران کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اور وہ اپنی پُرکیف زندگی کو جہنم میں بدل لے۔ اور دن رات سوچوں میں ڈوبا رہے۔

نجمہ جیسی لڑکی ان کے لائق نہیں بس اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔
میں تو خیال کرتا ہوں کہ اگر بیوی اچھی ہو تو گھر کی تمام فضا حسین اور پُرسکون ہوتی ہے۔ ایسا گھر جنت ارضی سے کم نہیں ہوتا۔ وہاں خاوند کو ذہنی سکون اور روحانی مسرت میسر ہوتی ہے۔ اس کا وقار بڑھتا ہے۔
خواجہ صاحب حیرانی سے طارق کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔ طارق بیٹا تم کیا کہہ رہے ہو؟
کیا نجمہ بدچلن ہے؟
طارق مسکرایا —— بدچلن — اوں!!
خواجہ صاحب وہ لڑکی ایسی ہے جس نے اپنی عزت کو کوڑی سے بھی زیادہ قیمتی نہ سمجھا۔ اس کی بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے جس نے والدین کی عزت کو سُولی پر چڑھا دیا۔ اس کے متعلق تو خواجہ صاحب وہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے۔
خواجہ صاحب نہایت غصّے میں غرائے!!
اتنی بدکردار چھوکری!!
میں کبھی ایسی بدقماش لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتا۔
خواجہ صاحب!! میں اس کے متعلق ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیں —— طارق نے مزید کہا۔
آپ کو معلوم ہے کہ نجمہ کالج میں پڑھتی رہی ہے۔ خواجہ صاحب!! آپ تو بہتر جانتے ہیں آجکل - - —— ہاں!! ہاں!!

نجمہ کے ایک حمید نامی لڑکے سے کافی گہرے مراسم تھے۔ وہ اسکی ملاقات کے لیے گھر والوں سے کالج میں فنکشن اور ڈراموں کا بہانہ کر کے اس کے ساتھ تنہا گھوما پھرا کرتی تھی۔ بعض دفعہ سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے نجمہ حمید کے ساتھ ہوٹل میں راتیں بسر کرتی۔

حمید بھی بڑا چالاک اور عیار لڑکا تھا۔ پہلے پہل تو وہ نجمہ کو بیاہ لینے کا حسین خواب دکھاتا رہا۔ لیکن حمید کے والدین نہ مانے تو پھر ان دونوں نے گھر سے کہیں باہر بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ طارق تھوڑی دیر کے لیے یہ کہتے ہوئے رُک گیا۔ اور خواجہ صاحب کے چہرے پر اس کا ردعمل دیکھنے لگا۔

آگے کیا ہوا بیٹا طارق! خواجہ صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں تو ہوا یوں کہ خان ملک کو اس بات کا علم ہو گیا۔ انہوں نے نجمہ پر کڑی نگرانی شروع کر دی۔ وہ اپنے ارادے میں بڑے پکے تھے۔

ایک دن یوں ہوا کہ نجمہ اور حمید گاڑی پر سوار ہونے والے تھے کہ خان ملک نے ان دونوں کو سٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ وہاں سٹیشن پر کافی لوگ تھے۔ جن میں خان ملک کے جاننے والے بھی تھے۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کا چرچا گلی محلے میں ہونے لگا۔ بڑی بوڑھیاں اکٹھی بیٹھ کر کھسر پھسر کرنے لگیں۔

پھر بات رشتہ داروں اور عزیزوں تک جا پہنچی۔ انہوں نے بھی ان کا

ساتھ چھوڑ دیا۔ اور دوسرے لوگوں کی طرح خان ملک کو حقارت سے دیکھنے لگے، سب سے بڑی وجہ یہ تھی جس نے انہیں وہاں سے ترک سکونت کرنے پر مجبور کیا۔

خواجہ صاحب! یہ باتیں سن کر لال پیلے ہو گئے۔ اور چلا اُٹھے۔ ایسے ذلیل، کمینے!! انسان کی عصمت فروش بیٹی سے میں اپنے بیٹے کی شادی نہیں کر سکتا۔ میں آج ہی اس منگنی کو توڑنے کی اطلاع بھجوائے دیتا ہوں۔ خدا خوش رکھے تمہیں۔ طارق بیٹا! تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ورنہ ہمارا اس بدکردار لڑکی سے پالا پڑتا اور ذلیل و خوار ہو جاتے پھر لوگوں کے طعنے سُننے الگ پڑتے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہم اس گندگی سے بچ گئے۔

خواجہ صاحب!! یہ کہتے ہوئے مہر خانم کو طارق کے لیے چائے بنانے کے لیے کہا۔

خواجہ صاحب اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔

مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک ضروری کام سے آگے جا رہا تھا۔ بس راستے میں رُکا اور سوچا آپ سے بہت دن ہوئے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس لیے سلام ہی کرتا جاؤں۔

جیتے رہو۔ طارق خواجہ صاحب نے دُعا دی۔

بہت اچھا ہوا۔ ورنہ اس کمینے خاندان کے متعلق ہمیں اتنی خبر کہاں تھی۔ خواہ مخواہ کی رُسوائی کا داغ ہم اپنے ماتھے پر سجا لیتے۔ طارق چائے

پینے کے بعد کہنے لگا۔
خواجہ صاحب اجازت۔

ذرا جلدی ہے ورنہ میں تھوڑی دیر اور بیٹھ جاتا۔

اچھا بیٹا تمہاری مرضی —— خواجہ صاحب نے طارق سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

طارق ہنستا مسکراتا واپس لوٹا۔ آج وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ جب اپنے گھر کے قریب پہنچا تو سعید وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ کہو یار طارق کیسی رہی؟

سعید!! ہم ٹھہرے اُستادوں کے بھی اُستاد ہم سے کون ٹکر لے۔ طارق نے بڑے فخر سے کہا۔

یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

آج سے خواجہ صاحب اور خان ملک ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ بس اپنے ارادے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ خان ملک بھی کیا کرے گا۔ اس نے مجھے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ بے چارے ہمارے جوہر سے ناواقف تھے۔

دوسرے دن طارق دو ہفتے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلا گیا۔ سعید بہت خوش تھا۔ چونکہ اس کی دلی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ وہ مدت سے اپنی نظر نجمہ پر لگائے بیٹھا تھا۔ چونکہ نجمہ نہایت سُلجھی ہوئی خوبصورت اور

پڑھی لکھی لڑکی تھی وہ اُسے اس وقت سے جانتا تھا۔ جب وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ ویسے سعید کو اس سے بات کرنے کا آج تک موقعہ نہ ملا تھا۔ لیکن سعید نجمہ کے کردار افتاد طبع اور اس کی نہایت درجہ سنجیدگی اور سادگی کو پسند کرتا تھا۔ یہی صفات اسکی انفرادی حیثیت کو برقرار رکھتی تھیں۔

سعید کو یہ بھی پتہ تھا کہ اس کے لیے خاندان سے بھی بہت سے رشتے آچکے تھے۔ مگر وہ دیہات کی گنوار لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ بیوی ہو تو خوبصورت اور پڑھی لکھی ہو۔ اور اس لحاظ سے وہ نجمہ کو اپنا آئیڈیل بنا چکا تھا۔

سعید نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے والدین سے کیا۔ سعید چونکہ خاندان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے وہ اس کو بہت چاہتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے کی خواہش کا احترام کیا اور دوسرے دن اس کے والدین نجمہ کے رشتہ کے لیے خان ملک کے گھر گئے چونکہ خان ملک نے خواجہ صاحب کے انکار پر ان سے انتقام لینے اور انہیں یہ دکھانے کے لیے کہ اچھے اچھے رشتے اور بھی مل سکتے ہیں۔ باتوں باتوں میں رشتے کی حامی بھر لی۔ اس طرح سعید اور نجمہ کی ایک ہفتہ بعد شادی بھی ہو گئی۔

جب طارق دو ہفتے کی چھٹی گزار کر واپس آیا تو اس کی ملاقات سعید سے ہوئی طارق نے پوچھا۔

سعید!! یہاں کیا حالات ہیں ۔
سعید!! نے کچھ سوچ کر کہا۔
یار! ایسی تو کوئی بات نہیں کھٹ پٹ کا ہے کی خواجہ صاحب اپنی جگہ راضی اور خان ملک اپنی جگہ مطمئن اور نجمہ اپنے گھر میں خوش و خرم ہے۔
ایں ایں !! کیا ہوا نجمہ اپنے گھر میں خوش و خرم ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
مگر اسے تو اپنی منگنی کے ٹوٹ جانے کا صدمہ ہونا چاہیئے تھا۔
نہیں طارق! سعید نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
اسے کیوں صدمہ ہوتا۔ طارق یہ بتاؤ کہ تم میرے جگری دوست نہیں ہو؟
اس میں بھی کوئی شک ہے۔ کیا تم اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ ہماری دوستی گلی محلے بلکہ شہر بھر میں مثالی ہے۔ سعید نے بہت ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں ۔
سعید!! تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ طارق نے مزید اصرار کیا۔
آخر تم آج یہ اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو ۔ اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ سعید! یاد رکھو میری تمہاری دوستی ہمیشہ باقی رہے گی۔ دعا کیا کرو! طارق نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔
طارق ـــــ کیا واقعی ایسا ہے۔
اس پر سعید نے طارق کو آزمانا چاہا اور یوں کہنے لگا۔
طارق اگر میں کوئی بات کہوں تم برا تو نہیں مانو گے ۔

سعید بھائی پہلے ایسا ہوا ہے، ہم ایسی کوئی بات نہیں کرتے جس کا بعد میں بُرا محسوس کیا جائے۔ اگر ایسی بھی کوئی بات ہو تو بھی میں بُرا نہیں مانوں گا۔

طارق !! خدا کی قسم تم کتنے عظیم انسان ہو۔

پھر سوچ لو ——— کہیں ! سعید نے زور دیتے ہوئے کہا۔

سعید !! ——— تم کہہ کے دیکھو۔

میں انشاءاللہ تمہاری آزمائش پر پورا اتروں گا۔

طارق نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

طارق چلو ذرا باہر چلتے ہیں۔ سعید نے دعوت دیتے ہوئے کہا اس کے بعد طارق اور سعید قریب ہی ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے اور سعید نے بیٹھتے ہی ویٹر کو بلا کر چائے اور مٹھائی کا آرڈر دیا۔

طارق نے جب یہ سب دیکھا تو کہنے لگا۔

سعید !! یہ سب کیا چکر ہے۔

طارق میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ زندگی میں بعض عجیب واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ سعید بے تکے انداز میں کہتا رہا۔

سعید یار ! یہ سب فلسفہ کیا ہے۔ طارق نے ذرا بیزار ہوتے ہوئے پوچھا کوئی مطلب کی بات کرو ! اب تک یوں ہی اوٹ پٹانگ ہانکے جا رہے ہو۔

طارق ! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ سعید نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ کبھی

ایک کی خواہش پُورا کرنے کے لیے دوسرے کو کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے ۔ ایثار و قربانی کا بھرم تب ہی قائم رہتا ہے ۔

طارق ! میں اُمید کرتا ہوں کہ تم میری خوشی میں شریک ہو گے ۔

سعید نے اُمید بھری نگاہوں سے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

سعید !! بھائی جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہو ۔

میں نے تمہیں یقین دلا دیا ہے ۔ کہ میں اپنی جان تک تم پر قربان کر سکتا ہوں ۔

تم کہو تو سہی !! ——— طارق نے حیرانی اور خوشی کے ملے جُلے جذبات میں بمشکل کہا

اس پر سعید نے کہا ۔

طارق بھائی اصل بات یہ ہے کہ میں ——— میں نجمہ کو چاہتا ہوں ۔

جب میں نے سُنا کہ نجمہ کی منگنی کامران سے ہو گئی ہے تو یہ بات میرے لیے میرے ارمانوں کی موت تھی ۔ مگر دل پر پتھر رکھ کر ان حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا ۔ اچانک تم سامنے آ گئے ۔ پھر کچھ سوچ کر میں نے تمہیں اکسایا ۔

تمہیں یاد ہو گا کہ ——— میں نے تمہیں بہت کچھ کہا تھا ۔

پھر تمہاری ذہانت نے وہ کمال دکھایا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے ۔

یہ سُنتے ہی طارق پر بجلی گری ۔ اور اس نے کہا ۔

سعید کیا تم نے نجمہ سے شادی کر لی ہے ۔

طارق ——— ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ میں نے اپنی خواہش کا اظہار اپنے والدین سے کیا۔ انہوں نے میرا دل نہیں توڑا اور پچھلے ہفتہ نجمہ سے میری شادی ہوگئی مجھے دلی افسوس ہے کہ حالات کی سنگینی اور وقت کی قلت کے سبب میں آپ کا انتظار نہ کر سکا۔

طارق غصّے سے بپھر گیا۔

سعید!! تم نے مجھے فریب دیا ہے، صرف اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا ہے، یہ کمینہ پن ہے۔ ذلالت ہے۔ تم نے دوستی کے پردے میں ظلم کیا ہے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم وہ نہیں نکلے جو میں تمہیں سمجھتا تھا۔ تم نے اس کے برعکس یہ سب کچھ کیا۔ تم میری زندگی سے کھیلے ہو!

طارق!! ——— بھائی خدا کے لیے ناراض نہ ہو!

مجھ سے غلطی ہوئی ہے، معافی چاہتا ہوں۔ دوست ہی ایک دوسرے کے آڑے وقت کام آتے ہیں۔ آپ میرے دوست ہیں اگر یہ کام آپ سے نہ کراتا تو اور کس سے توقع رکھتا۔

سعید!!

یہ کہتے ہوئے طارق نے مٹھائی کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

طارق ——— طارق!! سعید پکارتا رہا لیکن طارق دروازے سے باہر جا چکا تھا۔ اور سڑک پر اس کا سایہ چھپتا جا رہا تھا۔

"خانقاہ"

ریسٹ ہاؤس سے کچھ دور ایک خانقاہ نظر آتی ہے۔ اکثر سیاح یہاں ریسٹ ہاؤس کے دائیں طرف کے لان میں سبز سبز گھاس پر بیٹھے گھنٹوں سفید خانقاہ کو دیکھتے ہیں۔ خانقاہ کے پاس ہی کنواں ہے۔ جہاں لڑکیوں کے جھرمٹ اور ان کے الھڑ قہقہوں کے جلترنگ سے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ کسی ٹوٹے ہوئے اور تاریک مکان میں جیسے چاند کی گنگناتی کرنیں در آئی ہوں۔ کنوئیں کی منڈیر سے جب کوئی دوشیزہ پانی بھرے ہوئے گھڑے کو اٹھا کر سر پر رکھتی ہے اور دوسرے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے کولہے پر رکھ کر پگڈنڈی پر خراماں خراماں چلتی ہے۔ تو ارد گرد یوں لگتا ہے،

جیسے حسن فطرت میں بھونچال کی کیفیت ہو۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شہر سے آنے والے ریسٹ ہاؤس کے قریب سے گزرنے والے گڈریوں سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے کچھ مبہم سے انداز میں اپنا مدعا بیان کر ڈالتے ہیں سیدھے سادھے گڈریے جواب دیئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ تہذیب کے متوالے کیا جانیں کہ یہاں زندگی کسقدر گراں اور بوجھل ہے۔ وہ یہاں آکر بھی فلموں میں دکھائی گئی زندگی کی تلاش کرتے ہیں ان کو کیا خبر؟ ہمارے جذبات تو ان بھاری بھاری پتھروں کے تلے دب جاتے ہیں۔ اور پھر یوں ہو جاتے ہیں جیسے کوئی بچہ گلاب کی چند پتیاں اور خوش رنگ تتلیوں کے پروں کو اپنی سب سے موٹی اور وزنی کتاب میں رکھ کر بھول جائے اور پھر جب اُسے یاد آئے تو کتاب میں سے اپنی رکھی ہوئی پتیاں اور پَر نکالے اور تھوڑی دیر کے لیے خوش ہو جائے۔

عاقل گم سم کرسی پر بیٹھا تھا اور چوکیدار کا انتظار کر رہا تھا۔

"صاحب"! عاقل کو اچانک آواز نے چونکا دیا۔

عاقل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان کھڑا تھا۔

"صاحب! آپ کا سارا سامان رکھ دیا ہے۔ اور کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ آپ اندر چل کر آرام فرمائیں۔ میں آپ کے لیے غسل کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ چائے کے لیے میں نے باورچی سے کہہ دیا ہے۔ آپ غسل سے فارغ ہونگے تو میں چائے لے آؤں گا۔

عاقل جب باہر آیا تو میز پر چائے تیار رکھی تھی۔ اور نوجوان لڑکا پاس کھڑا تھا۔

"کیا تم غازی باباکے بیٹے ہو" عاقل نے لڑکے سے سوال کیا۔ تمہارا نام کیا ہے۔

جی !! صاحب ! میں ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار ہوں۔

"میرا نام اچھو ہے"۔ لڑکے نے تیزی سے جواب دیا۔

غازی بابا نے تو نوکری چھوڑ دی تھی۔ وہ تو کہیں چلا گیا ہے۔ اس کا کسی کو پتہ نہیں نہ جانے وہ کہاں گیا ہے۔ اچھو نے مزید غازی باباکے متعلق کچھ نہ بتایا۔

خیر !! اچھو اب تم جاؤ تھوڑی دیر میں آکر برتن لے جانا۔

عاقل نے چائے کی پیالی کا آخری گھونٹ لے کر سوچا کہ سال میں ہی کس قدر تبدیلیاں آگئیں۔ حالانکہ ریسٹ ہاؤس وہی ہے۔ سرو کے درخت بھی اپنی جگہ پر موجود لہلہا رہے ہیں۔ کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوا کے دوش پر اسی طرح لہرا رہے ہیں۔ گھاس کے مخملیں میدان بھی ویسے ہیں۔ جیسے سال پہلے تھے۔ اور ایک تبدیلی پر عاقل کو بڑا احساس ہوا۔ لیکن غازی بابا کا ریسٹ ہاؤس سے نوکری چھوڑ دینا اور اس طرح غائب ہو جانا یہ سب عاقل کو بہت پریشان کر رہا تھا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھا گہری سوچ میں ڈوبا دیر تک دور سفید خانقاہ کی طرف دیکھتا رہا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ عاقل تھکن کے باوجود سو نہ سکا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ خنک ہوا کے جھونکے فضا کو نم آلود کر رہے تھے۔ سبز گھاس پر رکھے ہوئے ننگے پاؤں شبنمی ٹھنڈک محسوس کرنے لگے۔ چاند دھیرے دھیرے بدلیوں کی اوٹ سے نکل رہا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ فطرت گہری نیند کے ہلکورے لے رہی تھی۔ سرو اور سفیدے کے درختوں پر سرمری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا میں بھینی خوشبوئیں بکھر رہی تھیں۔ حسن فطرت ہر سو رقصاں تھا۔ پہاڑی کے پرے ندی کا شفاف پانی اُبھری ہوئی چٹانوں پر پڑے ہوئے پتھروں اور چھوٹے چھوٹے کنکروں سے ٹکرا کر وادی کو نغمہ بار کر رہا تھا۔

عاقل قدرت کی دلفریب رعنائیاں دیکھ رہا تھا۔ اور ایک کیف اسکی روح کی گہرائیوں میں یوں اُتر رہا تھا جس طرح اسفنج میں شفاف پانی جذب ہو جاتا ہے۔

عاقل رات بھر بے چین رہا نہ جانے کون سی بات پر اسے ہر دو ایک گھنٹے کی ٹوٹی ہوئی نیند کے بعد شدت سے بدن کے جوڑوں میں درد اور تھکن سے ٹیسیں اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ کروٹ بدل کر کھڑکی سے باہر چاند کی روشنی میں جو صحن کے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر سبزے پر کھیل رہی تھی۔ جیسے حسین منظر سے دل کو بہلانے کی ناکام کوشش کرنے لگا ہو۔ رہ رہ کر اسے غازی بابا کا خیال آتا۔ اور وہ اس کے اچانک چلے جانے کے مسئلے کو سلجھانے اور جاننے کی کوشش

کرتا رہا۔ لیکن عاقل جوں جوں اس کے بارے میں سوچتا غازی بابا کی شخصیت اس قدر اُلجھے ہوئے دھاگے کی طرح اس کے سامنے آنے لگی۔

آخر وہ تھک کر سوچنے لگا کہ کیوں نہ کل اچھو سے ہی پوچھا جائے۔ ہاں! ہاں!! ٹھیک بیکار اس طرح سر کھپانا کوئی عقل مندی نہیں۔

صبح جب اچھو ناشتہ لے کر آیا تو عاقل پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"اچھو! غازی بابا کے متعلق کسی بات کا پتہ ہو تو بتاؤ۔ پھر اچھو کی سہمی ہوئی خاموشی کو توڑنے کے لیے عاقل نے خود ہی کہا۔

غازی بابا بڑا اچھا انسان تھا۔ میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں اور جب بھی یہاں آتا تھا۔ اس کی عجیب باتیں سُننے میں بڑا لطف رہتا تھا۔ وہ بڑا داستان گو تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔

صاحب!! آپ کی عمر لمبی ہو۔ یہ غازی بابا کا مخصوص فقرہ تھا۔ جس کے بعد وہ کہتا یہ ندی جو پہاڑی کے اس پار ہے نا۔ اس کے دوسرے سرے پر چڑیلیں رہتی ہیں۔ صاحب ادھر لوگ نہیں جاتے جو جائے تو وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ کبھی وہ اپنی جوانی کے کہانی قصّے اور بہادری کے واقعات سُناتا تو اس کے ماتھے پر جھریاں سکڑ کر ایک جال سا بنا دیتیں۔

پھر اچانک کچھ سوچ کر کہتا۔

نہ جانے لوگ کیا سے کیا ہو گئے ہیں؟ غازی نے بات آگے چلاتے

ہوئے کہا۔ صاحب! یہ خانقاہ جو سامنے آپ دیکھ رہے ہیں نا یہ بڑے
شاہ جی کا مزار ہے۔ وہ بڑے ولی مرد تھے۔ ان کی کرامات علاقے بھر
میں عام ہیں۔ ان کے مزار کے باغیچے میں چاند کی چودھویں کو کوہ قاف
سے پریاں آکر ناچا کرتی ہیں۔ پھر اس نے کچھ خوف کے لہجے میں مزید بتایا
تھا۔

صاحب! یہ بستی اب تباہ ہو جائے گی۔ اس نے بڑے سنسنی
خیز انکشاف کیے۔ عاقل نے تشویش کے لہجہ میں پوچھا "وہ کیوں...؟
شاہ جی بستی کے لوگوں سے ناراض ہو گئے صاحب!
پچھلے سال آناً فاناً گھر گھر سے ڈھور ڈنگر مر گئے تھے۔ برسات
کے پُر زور پانی نے چند آدمیوں کو اپنے ساتھ بہا کر ہلاک کر دیا تھا۔
ولی مرد اپنا آپ دکھا دیتے ہیں۔ غازی بابا نے زور دے کر کہا۔
شاہ جی کے غصے کو محبت میں بدلنے کے لیے مولوی صاحب کے
کہنے پر خانقاہ پر چند بکرے بھی ذبح کر کے غربا و مساکین میں تقسیم
کر دیئے گئے۔ اور میں نے گاؤں گاؤں سے آٹا دانا اکٹھا کر کے بھنڈارا
بھی دلایا تھا۔ لیکن شاہ جی بہت ہی جلال والے پیر ہیں۔ صاحب!
وہ اس بستی کے لوگوں کو سبق سکھا کر ہی راضی ہوں گے۔ غازی بابا
نے کچھ رُک کر کہا۔ کل میں وہاں گیا تھا۔ ان کے مزار پر جو ملنگ بیٹھتا
ہے نا۔ . . . وہ کہہ رہا تھا کہ
اس نے کل شاہ جی کو خواب میں دیکھا ہے۔ ان کی آنکھیں سُرخ

تھیں اور ایک خونخوار شیر کی پیٹھ پر سوار بستی کی طرف آرہے تھے
ان کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کہا
تھا تو شاہ جی نے رُعب دار آواز میں کہا۔

"او ساجو ملنگ"

ان بستی والوں سے کہو کہ میری قدر کریں اور جا کر ان سے پوچھو انہوں نے جمعرات کے روز میرے مزار پر حاضری دینا کیوں ترک کر دی ہے۔ میرے سرہانے پڑے ہوئے دیئے کب سے بجھے ہوئے ہیں۔ میں ان کو تباہ کر دوں گا کیا یاد کریں گے۔؟

ہاں ساجو!

ان بستی والوں سے یہ بھی کہو کہ میرے مزار پر کسی نیک آدمی کو چلے کے لیے بٹھائیں غازی بابا اپنی دھن میں کہہ رہا تھا۔ یہ کہہ کر وہ اچانک زمین کے اندر غائب ہو گئے۔ ساجو ملنگ نے خوف سے کانپتے ہوئے بتایا۔ ساجو ملنگ خوف سے اس قدر ڈر گیا تھا کہ دو دن تک بخار میں مُبتلا رہا۔

یہ خبر جب بستی پہنچی تو لوگ خوف زدہ سے رہنے لگے۔ آئندہ جمعرات سے خانقاہ پر مرد عورتیں حاضری دینے کے لیے جانا شروع ہو گئے اور اکثر گاؤں کی نوجوان دوشیزائیں آرزوؤں میں ڈوبے ہوئے دل لے کر چراغ بھی جلانے آنے لگیں۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"انہی دنوں پیر صاحب میرے گھر قیام رکھتے تھے، غازی بابا نے بڑے فخر سے کہا۔ میں نے ریسٹ ہاؤس سے دو ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی اور ہم سب گھر والے ان کی خاطر مدارت میں دل و جان سے مصروف تھے۔ ہمارے پیر صاحب بھی بڑے پہنچے ولی مرد ہیں۔ وہ جس سے راضی ہو جائیں وہ تو رنگا ہی جاتا ہے۔ ان کا لکھا ہوا تعویز آج تک بے اثر ثابت نہیں ہوا۔ اس قدر جاذب شخصیت رکھتے ہیں کہ جب محفل میں ذکر کرتے ہیں تو محفل نشینوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر وہ رُک کر کہنے لگا۔

صاحب بہادر!! عجیب سماں ہوتا ہے آپ کو ان سے ملادوں گا، آپ خود دیکھ لیں گے ساجو کے کہنے پر باقی کام تو ہو رہے تھے لیکن چلہ کشی کے لیے کوئی تیار نہ ہوتا تھا۔ سب خوف سے انکار کر دیتے اور پھر کس میں دم کہ وہ غازی بابا سے پریشانی کا اظہار کرے۔

ایک دن جب پیر صاحب محفل میں بیٹھے ہوئے رحمدل نظر آئے تو میں نے عاجزی کے ساتھ عرض کیا۔

باباحضرت! ایک عرض ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو ہماری مُصیبت ٹل سکتی ہے۔

جی جی!! حضور ہم سب آپ سے عرض کرتے ہیں۔ محفل میں بیٹھے ہوئے تمام مریدوں نے ایک آواز ہو کر کہا۔

غازی! مجھے جانچنے کی کوشش نہ کرو۔

اس پر سب مُرید سہم گے لیکن محفل میں بیٹھی ہوئی خواتین نے آنکھوں سے آنسوؤں کو دو پٹوں سے پونچھتے ہوئے کہا پیر صاحب! ہم پر رحم کریں۔ غازی ٹھیک کہتا ہے۔ ہم لوگ بڑی مشکل میں ہیں۔ آپ کو ہم کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ دودھ اور خوراک ہم سب باری باری لائیں گے۔

یا حضرت! غازی نے کہا۔

میری بیٹی نذراں روز شام کو دیے جلانے شاہ جی کے مزار پر جاتی ہے۔ وہ آپ کے لیے دودھ اور پھل بھی لے آیا کرے گی آپ ہم سب کے لیے شاہ جی کے مزار پر چلہ کریں۔

غازی! مرشد کامل کا کام ہے۔ اپنے مریدوں کی مشکل وقت میں مدد فرمائے۔ کل سے میں شاہ جی کے مزار پر چلّے کے لیے بیٹھوں گا۔ سب لوگ خوش ہو گئے۔

دوسرے دن میں نے اپنے پیر صاحب کو نیا جوڑا زیب تن کرایا اور اگر بتیاں جلا کر ان کے جلوس کے آگے آگے ذکر کرتا ہوا چلا۔ تمام لوگ ان کے پیچھے تھے۔ اس طرح ہم پیر صاحب کو شاہ جی کے مزار پر چھوڑ آئے۔ وہ شام کے بعد چلّے کے لیے بیٹھ گئے۔ اور ہم سب واپس بستی میں آ گئے۔ غازی بابا نے یہ سب کچھ مجھے بتایا تھا۔

عاقل نے اچھو سے کہا۔

اچھو یہ تو آج سے ایک سال پہلے کی بات ہے جب میں حسبِ معمول یہاں آیا تھا۔ اور اس وقت غازی بابا یہاں چوکیدار تھا۔

ہاں!! اچھو! تمہیں تو غازی بابا کے متعلق اور کچھ بھی معلوم ہوگا۔ آخر ایسی کون سی بات تھی جس سے غازی بابا اپنا گھر بار چھوڑ کر چلا گیا۔ اور اب تک واپس نہیں آیا۔ عاقل نے کرید تے ہوئے پوچھا۔

صاحب بہادر! میں نے لوگوں سے سُنا ہے کہ اس کی لڑکی نذراں جوان تھی۔ نہیں! نہیں!! صاحب شرم کی بات ہے۔ کیا بتاؤں؟ وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

شرم کی کون سی بات ہے۔ اچھو بتاؤ —— بتاؤ!!

صاحب جی! سب کہتے ہیں۔ اچھو نے ڈرتے ہوئے کہا۔

نذراں ایک شام پیر صاحب کے لیے دُودھ اور پھل لے کر گئی تھی اور چونکہ وہ دیئے جلانے بھی جایا کرتی تھی۔ اس لیے وہ ہر روز کی طرح ذرا جلدی ہی گھر سے چلی گئی۔

پیر صاحب! نذراں کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ اسے اپنی بیٹی کہتے تھے۔ غازی بابا بھی اس بات پر عقیدت سے خوش تھا کہ پیر صاحب کی نگاہ شفقت اس کی بیٹی پر ہے اور اسے مرید بھی بنایا ہے۔

لیکن صاحب! نذراں اس شام واپس گھر نہ لوٹی۔ غازی بابا نے سوچا کہ شاید پیر صاحب کی خاطر داری کے لیے وہیں رہ گئی ہو۔ لیکن صبح ہوئی نذراں ابھی تک گھر نہ پہنچی تھی۔ اب نذراں کو نہ پا

کر غازی بابا کو نہایت تشویش ہوئی۔ اِدھر اُدھر نذراں کی سہیلیوں کے ہاں گیا۔ لیکن نذراں وہاں کہاں ملتی۔ اس نے کل تک نوشاہی کے مزار پر دیئے جلائے تھے۔ لیکن غازی بابا کی عزت کا چراغ ہمیشہ کے لیے بُجھا کر نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ سب گاؤں میں چرچا ہونے لگا۔ چند بزرگ خانقاہ پر گئے۔ انہوں نے دیکھا وہاں نہ پیر صاحب تھے نہ نذراں صرف ملنگ تھا۔ جو پیپل کے سائے میں سو رہا تھا۔ اسے جگا کر پوچھا تو اس نے کہا۔

چودھری صاحب! پیر صاحب نے رات خوش ہو کر مجھے جھوٹا دودھ پلایا تھا۔ کیا سرور تھا اس میں۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ساری عمر ان کی خدمت میں رہوں اور اس طرح ان کے جھوٹے سے مست الست زندگی بسر کروں۔

پیر صاحب اندر ہی ہوں گے۔ پیر صاحب کامل فقیر ہیں۔ چلے میں ہر وقت غرق رہتے ہیں۔ انہیں دنیا کی کیا خبر۔ بستی کے لوگوں کی قسمت بدل جائے گی۔ ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر ملنگ کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑا لیکن وہ ہوش میں تھا کب؟ وہ نشے میں مدہوش ہوا تھا۔ وہ لوگ بھی واپس آگئے۔

صاحب!! اس بات کو سال سے اُوپر ہو چلا ہے۔ شام آتی ہے۔ اور پھر صبح کی شفق اُفق پر پھیل جاتی ہے۔ لیکن غازی بابا کی نذراں ابھی تک نہیں آئی۔

عورتیں کہتی ہیں کہ نذراں ——————

نذراں پیر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ وہ تو خود اب پیرنی بن گئی ہوگی

غازی بابا لوگوں کے یہ طعنے سُننے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ وہ خاموش

خاموش گلیوں میں پھرتا رہا۔ اور پھر چند دن بعد وہ بھی روپوش ہوگیا۔

آج تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔

ساجو ملنگ کہتا ہے کہ غازی بابا ایک روز شاہ جی کے مزار پہ آیا

تھا۔ ساجو نے چاہا تھا کہ بڑھ کر اسے سلام کرے اور نذراں کا حال

پوچھے۔ لیکن غازی بابا نے ملنگ کو یوں دیکھا جیسے وہ جانتا ہی نہ ہو۔

ساجو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ساجو ملنگ کہتا ہے کہ غازی بابا نے بڑھ کر خانقاہ کی جالی پر دو

تین بھاری پتھر دے مارے۔ اور قہقہے لگاتا اور بڑبڑاتا ہوا ندی کی

طرف چلا گیا۔

اچھو یہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

صاحب! میں غازی بابا کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا

ملنگ لوگوں کو کہتا پھرتا ہے کہ غازی بابا پاگل ہو گیا ہے اور رہا شاہ جی

کا مزار تو وہاں کیا ہوتا ہے۔ اور کیا نہیں ہوتا کہ اس راز کو بہت کم

لوگ جانتے ہیں۔

"روشنیوں کے سائے"

اس کے لیے اب شرافت اور آباؤ اجداد کا وقار بے معنی سی چیز تھی۔ وہ یورپ کی رنگینیوں میں بری طرح کھو گیا تھا۔ آج رات کلب میں بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔ رات بھیگ رہی تھی۔ اس نے خالی پیگ کتھیک میری کی طرف بڑھایا۔ وہ اس خالی پیگ کو چند لمحے گھورتی رہی۔ اور پھر اس نے اس کی طرف دیکھا اور پیگ کے خلا کو شراب سے پُر کرنے لگی۔ اس نے ہچکی لیتے ہوئے کتھیک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

کتھیک !!

تو جانتی ہے !!

جب میں وطن واپس جاؤں گا تو میرے بے تکلف دوست مجھ سے کیا پوچھیں گے ؟ اوہ ؟ —— تو بھلا کیا جانے —— مشرق کی فطرت کو۔۔۔ میں بھی پاگل ہوں جو تجھ سے ایسے سوال پوچھ رہا ہوں —— !

نہ تو نے مشرق دیکھا۔ اور نہ وہاں کے لوگوں کی محفل میں شریک ہوئی !!

تم تو صرف ان کلبوں کی روشنی کو جانتی ہو۔

اتنے میں کیتھیک نے بھی ایک پیگ چڑھالیا تھا اور دوسرا پیگ بنا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

ہاں تو —— تم مشرق کے گیت گا رہے تھے۔

مجھے کیا غرض کہ سمندر پار کے متعلق سوچوں کیتھیک نے جواباً کہا۔

تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

ہاں کیتھیک وہ سب سے پہلے اس بات پر اصرار کریں گے کہ یورپ کی نائٹ کلبیں کیسی ہیں ؟

تمھاری دوستی کے طفیل کیتھیک اب تو مجھے ہر بات کا علم ہے۔ میں انہیں تفصیل سے بتا سکوں گا۔

یورپ جنت ہے۔ آزادی ہے۔ ہر طرح کی آزادی ہے۔ محبت کی فراوانی ہے۔ یہاں محبت سستے داموں دستیاب ہے اسی لیے

تو ایک کو دس بلکہ زیادہ سے بھی محبت ہوتی ہے۔۔۔ ہاں!
کیتھلیک یہاں تمہارے ہاں محبت ایک خوش رنگ کھلونا ہے،
اِدھر اُدھر جہاں دیکھو جوان مرد اور عورتیں اس حسین کھلونے سے
کھیلتے نظر آتے ہیں۔ یہاں کے کلب کی جہاں جگمگاتی روشنی سے ہر وقت
دن کا گمان ہوتا ہے۔ راتیں جاگتیں ہیں اور دن ویران ہوتے ہیں۔
کیتھلیک تم تو جانتی ہو۔ اس روشنی کے بازار میں جسموں کی نمائش
لگتی ہے۔ اپنی اپنی پسند کا انتخاب ہوتا ہے پھر یہ گورے چِٹے جسم معمولی
معمولی قیمت پر بِک جاتے ہیں۔ صرف شراب کے ایک پیگ
کے عوض ایک گورا چِٹا جسم ——— رات کی رعنائیوں میں ڈوب
جاتا ہے۔ اور سورج کی روشنی ہوتے ہی یہ کھیل ختم ہو جاتا ہے۔
پھر یہ رات کے پنچھی دن بھر شام کے سائے ڈھلنے کا انتظار کرنے
لگتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس نے کیتھلیک سے اُکھڑے اُکھڑے سے
لہجے میں کہیں۔

پھر اس نے کیتھلیک کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔!
ہاں تو ان کا دوسرا سوال یہ ہوگا۔ کہ میں نے تجھ سے کتنا پیار کیا ہے؟
اور کس قدر میں تجھ سے محبت کرتا ہوں؟
میرا مطلب ہے ہم دونوں کے درمیان جو رشتہ تھا۔ اس کے بارے
میں بھی کچھ کہوں ——— اور ——— میں کہوں گا۔
میں نے بھی ایک یورپین لڑکی سے محبت کی تھی۔ ٹھیک ہے نا

اس نے کنھلیک سے پوچھنے کے سے انداز میں کہا۔
بھئی جواب دو !! جب اس نے مڑکر دیکھا تو کنھلیک کو اپنے پاس نہ پا کر کہنے لگا۔ کنھلیک میری تو کہاں چلی گئی؟ پھر خود ہی کہنے لگا۔ شاید اسے میری باتیں بری لگی ہوں
اسے بُری کیوں لگی ہوں۔ کیا یہ سب باتیں سچ نہیں ہیں۔
کنھلیک ناراض ہو گئی ہے تو ہو جائے ———!
جائے جہنم میں ———!!
صرف دو دن باقی ہیں۔ اس کے بعد میں واپس وطن چلا جاؤنگا۔ واپسی پر دیکھونگا۔ یہ نہیں! تو اور سہی۔
میں کیوں پریشان ہوں ——— پرسوں میں وطن چلا جاؤں گا۔
وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔
گھر کا خیال آتے ہی خیالات کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا اور وہ اس سیلاب کے گرداب میں غوطے کھانے لگا۔

اوہ!!

میں نے تو گھر والوں کو اپنی روانگی کی اطلاع بھی نہیں دی۔ وطن سے واپسی کے بارے میں کچھ نہیں ابھی کہہ سکتا۔ خیر کوئی بات نہیں مجھے اطلاع بھی نہیں دینی چاہیئے وہ لوگ مجھے اچانک گھر کے صحن میں دیکھ کر حیران ہوں گے۔ اور پھر یہ کہ وہ انتظار کی گھڑیاں گننے سے بھی بچ جائیں گے۔ جس روز میں گھر پہنچوں گا۔ وہ دن میری

بیٹی "کوکی" کی سالگرہ کا ہوگا۔ ایک طرف میرے اچانک پہنچنے پر "کوکی" بہت خوش ہوگی۔ دوسرے میں اس مرتبہ اسے نہایت عمدہ تحفے جاکر دوں گا۔ میری بیٹی کی خوشی دُگنی ہو جائے گی۔

اب رات کافی گزر چکی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے خیالات کی وادی میں بھٹک رہا تھا۔ اسے سوچتے سوچتے نیند آگئی۔ دوسرے روز جب وہ سو کر اٹھا تو اس کی طبیعت کچھ اُداس اداس سی تھی۔ رات کافی دیر جاگنے کی وجہ سے اور شاید کنھیک کے رویہ کے سبب اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔

اگلا دن بھی اس نے گھوم پھر کر گزار دیا۔ شام ہوئی تو عادت کے مطابق ہوٹل میں جاکر کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک کنھیک کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن آج وہ گئی رات تک نہ آئی۔ اُسے شاید اس کا واپس وطن جانا ناگوار گزرا تھا۔ اب تنہا بیٹھے بیٹھے وہ اُکتانے لگا۔ تو ویٹر کو بلاکر اسے مخصوص انداز میں آرڈر دیا اور پھر پیگ کے بعد پیگ پیتا رہا۔ اور جب رات کافی گزر گئی تو وہ واپس آکر اپنے فلیٹ میں صبح تک آرام کی خاطر بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز اس نے وطن واپس جانے کی خوشی میں سویرے سویرے ناشتہ کیا۔ اور اپنے دوستوں کو ملنے کے بعد فلائٹ سے وطن کی طرف پرواز کرنے لگا۔ چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد اب وہ اپنے شہر میں پہنچ چکا تھا۔ ایئرپورٹ سے گھر کی طرف آنے کے لیے

ٹیکسی پر سوار ہوا۔ جب ٹیکسی گھر کے قریب والے چوک پر پہنچی تو اس نے اتر کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ صرف نکڑ والے بجلی کے کھمبے کا بلب جل رہا تھا۔ جب وہ گلی کی نکڑ پر پہنچا تو وہاں دو آدمی کھڑے کھُسر پھُسر کر رہے تھے اس کے قدم تھوڑی دیر کے لیے رُک گئے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا یار! انور صاحب جب سے یورپ گئے ہیں۔ تو ماں بیٹی نے اپنی عزت وناموس کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ وہ مزید کچھ نہ سُن سکا۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ پھر اس نے اپنے مکان کی طرف محبت سے دیکھا۔

وہاں گیلری میں اور برآمدے سے باہر مختلف رنگوں کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ یہ سب بُجھتے اور جلتے قمقمے اسے یوں دکھائی دیئے۔ جیسے کسی بدکردار عورت کی آنکھ کبھی بند ہوتی ہے اور کبھی کھُلتی ہے۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں کو مل کر دیکھا۔ وہ حیران بھی تھا اور اُسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ یا کسی اور کے گھر کی طرف تو نہیں جا رہا۔ پھر اُسے خیال آیا اس کے گھر تو عزت و ناموس کے چراغ جلا کرتے تھے۔ مگر اس گھر کی سج دھج تو بالکل یورپ کی طرز کی ہے۔ خدایا کہیں میرا گھر اس آگ میں جل نہ گیا ہو، تہذیب کی بدنام دیوی کی بھینٹ نہ چڑھ گیا ہو۔ یہ جلتے بُجھتے قمقمے!

یہ جگمگ کرتی روشنیاں یہ عطر بیز فضا۔

میرے خدایا! یہ سب تو ہیں بہت دور چھوڑ آیا ہوں۔ اسے اپنا گھر کوئی کلب سے کم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر یہ میرا ہی گھر ہے۔

تو! اس کا ذمہ دار کون ہو سکتا ہے ؟

میری بیوی اور بیٹی کو کی یا میری دولت

اسی مخمصے میں اس کی انگلی کال بیل پر پڑی ۔

ٹرن!! ٹرن!!

بیل کی آواز پر اس کے بوجھل قدم غیر ارادی طور پر پیچھے پلٹنے لگے، نہ جانے کیوں۔ اس کے ذہن میں مختلف طرح کے خیالات اُبھر اُبھر کر زبان سے آواز بن کر گونجنے لگے۔

میں پوچھتا ہوں۔

آج کی ترقی پسند عورت اس طرح کے حقوق کے لیے ماری ماری پھر رہی ہے جس کے حصول کے لیے اسے کلبوں اور سوسائیٹیوں کو تشکیل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ ان کی آواز اجتماعی طور پر بلند ہو سکے۔ اس لیے کہ اب انہیں گھر کی چار دیواری کے اندر کی فضا سے اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔ وہ بچوں کی پرورش کرنا نہیں چاہتی۔ وہ چراغ خانہ کی جگہ شمع محفل بننا پسند کرتی ہے اس کی خواہش ہے کہ اس کے پروانے زیادہ سے زیادہ ہوں۔ وہ اپنے

آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا۔
کون سے حقوق ـــــ کیسے حقوق وہ حقوق جن کے وسیلے سے عورت کو ہر طرح کی آزادی مل جاتی ہے۔ وہ آزادی جو بزرگوں کے وقار اور ان کی عظمت کو ذلالت کے گڑھے میں ڈال دیتی ہے۔ وہ آزادی جو خاندان کی چولیں ہلا دیتی ہے۔ وہ آزادی جو خاوند کی غیرت پر گناہ کی دھول اڑاتی ہے۔ کلبوں میں ڈانس کرنے اور شراب نوشی کی آزادی غیروں کی آغوش سجانے کی آزادی" وہ نہایت جذباتی انداز میں کہے جا رہا تھا۔
یہی وہ آزادی تھی جو تین سال کے عرصے میں شاہد میری بیوی اور بیٹی کو مل گئی۔ اب تو وہ بہت خوش ہوں گی۔ خوش ہوں بھی کیوں نہ؟
انہیں اپنے حقوق جو مل گئے۔ جس کو اپنا جائز حق مل جائے اس کا خوش ہونا فطری امر ہے۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ اب کہاں جا رہا ہے۔ اس کی کون سی منزل ہے۔
میری منزل!! وہ بڑبڑایا۔
میری منزل روح ہے جو اس جسم سے آزاد ہو جائے اور دور اس پار چلی جائے جہاں پران قمقموں کی روشنی کے سائے میں رقص کرنے والے اور اخلاقی بندھنوں سے آزادی چاہنے والے نہیں ہوں گے آخر میں اس طرف کہاں جا رہا ہوں؟

نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ یہ سوچ کر پھر اس کے قدم آہستہ آہستہ گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

مجھے ذرا جلدی چلنا چاہیئے۔

یہ رات کا اندھیرا ایک پیشکش ہے۔ گھر والے اور محلے کے سب لوگ جانتے ہیں کہ میں ابھی یورپ سے واپس نہیں آیا اور یہ سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔ باورچی خانے کی کھڑکی کھلی دیکھ کر اسے اپنے جسم میں جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ میں اسی راستے اندر جاؤں گا۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو پھیلا پھیلا کر دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ آرام سے دروازہ کھولا کمرے کا بلب جل رہا تھا۔

ہاجرہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

وہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ جب اس نے اس کے قریب ہو کر دیکھا تو اس کے منہ سے اٹھتے ہوئے شراب کی بو کے بھبکے اسے یہ صاف صاف بتا رہے تھے۔ کہ ہاجرہ نے کس قدر بہتات سے شراب پی ہے۔ اور شراب کے بعد اور کیا کچھ نہ ہوا ہو گا۔ آخر کوکی کی سالگرہ پر اس کے دوست احباب آئے ہوں گے۔ داد عیش دی ہو گی۔

وہ کمرے میں باقی ماحول کا بغور جائزہ لینے لگا۔

کمرے کی ان دیواروں پر جہاں کبھی قرآنی آیات کے فریم آویزاں

تھے۔ آج ان کی جگہ اخلاق سوز برہنہ اور پلے بوائز کی تصاویر لٹک رہی تھیں بالکل ان تصویروں کی طرح ہاجرہ بھی اپنا روپ دھارے نشے میں دھت پڑی تھی۔

یہ دیکھ کر اس نے اپنی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے پھیلایا اور اس کی طرف بڑھا۔ ہاجرہ کو جو اس کی بیوی تھی۔ سیدھے بل لٹایا۔ پھر اپنی انہی انگلیوں سے اس کی گردن کے گرد حلقہ بنایا پھر ڈر سے کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اچانک اس کی نظر کونے میں پڑی ہوئی میز پر جا پڑی جس پر شراب کی چند بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنے ہاتھوں کی گرفت کو ہاجرہ کی گردن پر ڈھیلا کیا۔ اور اس کو ویسے ہی چھوڑ کر ان بوتلوں کی طرف لپکا۔ ہر بوتل کو ہلا ہلا کر دیکھنے لگا۔ آخر ایک بوتل سے اُسے چند قطرے دکھائی دیئے ان کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں چمک عود کر آئی اور وہ فوراً ماضی کے غاروں میں داخل ہونے لگا۔

اُسے کتھیک میری یاد آنے لگی۔

وہ کس انداز سے اُسے پیگ بنا بنا کر پلایا کرتی تھی۔ اُسے پہلو میں بٹھا کر کتنا سکون ملتا تھا۔ پھر بوتل اس کے ہاتھ سے گر کر فرش پر ٹوٹ گئی۔ اس نے نیچے پڑی ہوئی کرچیں چن کر میز پر رکھ دیں۔

ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنا اٹیچی کھولنے لگا،
کوکی کے لیے لائے ہوئے تمام تحفے نکال کر کونے والی میز پر رکھ دیئے ، پھر مسکراتا ہوا ہاجرہ کے پاس گیا۔ وہ ابھی تک اسی انداز میں پڑی تھی۔ پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور پاس ہی لیٹ گیا۔

از :- صبیحہ رحمٰن

معمّہ

نسیم پہلی منزل میں بیٹھی ہوئی کوئی ناول پڑھ رہی تھی کہ چندا بھاگی بھاگی آئی۔ باجی۔ باجی۔ وہ والے بھائی جان آئے ہیں۔ نسیم نے جلدی سے پوچھا کون! کون!!"

چندا نے فوراً کہا "اسلم بھائی جان" نسیم نے منہ پھیر لیا۔ اور ناول پڑھنے لگی، چندا غور سے باجی کو دیکھنے لگی کہ انھوں نے ابھی تک کوئی جواب کیوں نہیں دیا۔ آخر اس نے خود ہی بیقراری سے پوچھا "کیا باجی جاؤ گی نہیں؟"

"بکواس مت کرو۔ چلی جاؤ یہاں سے"۔ چندا آج اپنی باجی کی ڈانٹ سُنکر بہت حیران ہوئی کہ آج آخر ہو کیا گیا ہے۔ باجی کو اس نے

اپنے آپ سے سوال کیا۔ یہ وہی باجی ہیں جو کبھی اسلم بھائی جان کا نام سنکر پوچھتی تھیں کہاں ہیں؟ کدھر ہیں اور آج وہی ہیں کہ ان کے آجانے پر غصے ہو رہی ہیں۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور خاموشی سے اپنی فراک کے ساتھ آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر ہی نکلی تھی کہ برآمدے میں اسلم سے ملاقات ہو گئی۔
"کیوں کیا ہوا میری چندا کو"؟ اسلم نے پیار کے انداز سے پوچھا بجائے جواب دینے کے چندا نے اور بھی رونا شروع کر دیا۔ مگر جب اس نے ہمدردی کے ساتھ اور پوچھا تو اُسے بتانا ہی پڑا۔

ارے بس اتنی سی بات پر۔ تیری باجی کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے اچھا وہ ہیں کہاں؟ کمرے کی طرف چندا نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ کہ وہ یہاں ہیں اور جب وہ بتا کر جانے لگی تو اسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ آؤ میں صلح کرا دیتا ہوں"۔ ساتھ ہی اس نے کمرہ میں پہنچ کر کہا۔ "کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"
نسیم نے غصہ سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "نہیں"
اسلم تعجب خیز نظروں سے نسیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اور جب ضبط نہ ہو سکا تو بولا۔

"اجی اتنا بھی غصہ ٹھیک نہیں"۔ اور ساتھ ہی کمرہ میں داخل ہو گیا۔

چندا برابر رو رہی تھی۔ مگر اسلم کی طرف غصہ سے دیکھ کر نسیم نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔ دیکھئے آپ مجھے اس وقت تنگ نہ کریں۔ اور اس کمرے سے فوراً باہر چلے جائیں"۔ اسلم پر جیسے بجلی گر پڑی۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے نسیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اسلم چلے جاؤ۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں میری طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ کمینے ذلیل نکل جاؤ فوراً؟ اور جب اس کی زبان بالکل ہی بے قابو ہو گئی تو اسلم سر جھکائے کمرہ سے باہر جانے لگا، وہ جا رہا تھا۔ اور نسیم اسے حقارت سے دیکھ رہی تھی۔ اسلم جس سے کبھی اس نے محبت کی تھی۔ جس کو اپنے تصورات کی دنیا میں ایک شعر تصور کیا تھا۔ جس کے سائے میں وہ اپنے حسین مستقبل کا خیمہ نصب کرنا چاہتی تھی۔ نسیم بھول گئی کہ یہ وہی اسلم ہے جس نے اس کے من کے ساگر میں پیاری پیاری لہریں پیدا کیں تھیں۔ جس سے اس کے خیالات میں سرکش موجوں نے سر اٹھانا شروع کیا تھا۔ ابھی وہ ان خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کہ اس کی اماں کمرے میں آئیں۔ اور انہوں نے نسیم سے کہا کہ بیٹی نسیم تو نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تیری ماں ہوں، صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتی کل وہ لوگ کراچی سے آ رہے ہیں۔ ارشد لڑکا بھی قابل ہے۔ اور پھر غیر نہیں۔ تیرے چچا کا لڑکا ہے۔ "امی آپ جو چاہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

یہ سُنتے ہی اماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اور ذرا سی دیر میں پورے گھر میں رونقیں بکھر گئیں۔ تنہائی میں وہ سوچنے لگی کہ اب میں ارشد کی ہو چکی ہوں اور اسلم جس نے اس کے دل کے بند دریچوں پر دستک دی تھی اور جس کا خلوص کے ساتھ اس نے استقبال کیا تھا۔ آج اس نے خود ہی اپنے دل کے دریچوں سے نکال دیا ہے۔ پھر ایک بار اور اس نے اپنی عزیز ترین سہیلی سعیدہ کا خط پڑھا۔

میری پیاری جان نسیم

خلوص بھرا اسلام قبول کرو۔

تم نے بہت دنوں بعد مجھے یاد کیا۔ لائل پور آئے ہوئے تقریباً مجھے ایک سال ہو گیا لیکن تم نے مجھے پہلی بار یاد کیا۔ خیر تم نے لکھا ہے کہ ارشد کے ساتھ تمہاری شادی کی بات چل رہی ہے۔ اور امی بھی بضد ہیں۔

بھئی جان! دیکھو اگر تم مجھے اپنا سمجھتی ہو تو پھر میری مانو اور ارشد بھائی سے شادی کی ہاں کر دو۔ میں نے کراچی میں کئی بار ارشد سے ملاقات کی۔ بھئی بہت اچھا لڑکا ہے۔ خوبصورت اور خوب سیرت بھی۔ میرا خیال یہی ہے کہ تم اس سے شادی کر لو۔ اور اسلم کا خیال دل سے نکال دو۔ خدا جانے وہ کمینہ تمہارے دل میں کیوں سمایا ہوا ہے۔ غصہ نہ کرنا نسیم! میں اسے اچھی طرح

جانتی ہوں۔ آخر میری خالہ کا لڑکا ہے۔ میں حقیقت لکھ رہی ہوں
اگر تم نے اسلم کی خاطر زندگی تباہ کرنی ہے تو ضرور کرو۔ نسیم تم کتنی
بھولی ہو۔ کہ اب تک اس سے محبت کرتی ہو۔ اور وہ ہر لڑکی کو
دیکھتے ہی دل دے دیتا ہے۔ میری جان ہر ایک کو اپنی طرح
صاف دل نہ سمجھا کرو۔

مائی ڈیئر دیکھو تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔ تم میری عزیز
ترین سہیلی ہو اور میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی ذراسی حماقت پر اپنا
سب کچھ کھو بیٹھو۔ جس کی تلافی زندگی بھر نہ کر سکو۔ پھر مجھ سے گلہ
نہ کرنا۔ خالہ اور خالو بھی اس کی حرکتوں سے بہت تنگ ہیں
خدا جانے تم جیسی کتنی بھولی بھالی لڑکیاں دھوکہ کھا چکی ہونگی۔
ہو سکتا ہے تم بھی ایک دن اس کے فریب کا شکار ہو جاؤ۔
میری بنو میری بات مانو اور اس ذلیل کا خیال دل سے نکال دو۔
اور ارشد بھائی کے ساتھ اپنی دنیا بسا لو۔ اُمید ہے تم میرے کہنے
پر عمل کرو گی۔

فقط تمہاری سہیلی سعیدہ

نسیم نے سعیدہ کا خط لفافہ میں بند کیا اور سوچنے لگی حقیقت
لکھی ہے وہ آخر اس کی خالہ کا لڑکا ہے۔ یقیناً وہ مجھ سے زیادہ
جانتی ہو گی۔ آخر سعیدہ کو کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ میں اس کی
برائی مجھ سے کرے۔

ہونہہ . . . آئے تھے بڑے مجھ سے ملنے اپنا جیسا منہ لے کر چلے گئے۔ اچھا ہوا میں نے سعیدہ سے مشورہ لے لیا۔ ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ غرضیکہ نسیم کی شادی ارشد سے ہو گئی اور اب نسیم کو سب کچھ مل گیا۔ جو اسے خواہش تھی۔ خوبصورت بچے پیارا گھر چاہنے والا شوہر زندگی بڑے آرام سے کٹ رہی تھی۔ ایک دن نوکرانی آئی اور کہنے لگی۔ بیگم صاحبہ آپ کی ڈاک نسیم نے ایک لفافہ چاک کیا۔ یہ خط اسلم کی والدہ کا تھا۔

پیاری بیٹی نسیم، دعائیں۔

اُمید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ یہ پڑھ کر تمہیں افسوس ہو گا کہ اسلم اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ کسی کی بات نہیں سُنتا۔ ہر وقت گم سُم رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہاری بات ضرور مان جائے گا۔ تم بذریعہ خط اسے سمجھاؤ۔ اور ممکن ہو تو خود آنے کی کوشش کرو۔

دُعا گو

تمہاری خالہ

دوسرا لفافہ سعیدہ کا تھا۔

پیاری نسیم!

تسلیم!

تم خود غرضی کہو یا کم ظرفی مگر میں یہ خط اس لیے لکھ رہی ہوں

کہ تم مجھے معاف کر دو۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں بہت بڑا دھوکہ دیا۔ میں نے اسلم بھائی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ سب غلط تھا۔ میری یہی کوشش تھی کہ تم اس سے نفرت کرو تاکہ میری محبت پروان چڑھ سکے۔ کیونکہ ایک عرصہ سے میں ان کی محبت حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اور تم نے جب دل جیت لیا تو میں نے تمہارے دل میں نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہو گئی۔ مگر اسلم اب دنیا کی ہر عورت سے نفرت کرتے ہیں۔ اسلم کو میں بہت دل و جان سے چاہتی تھی اور چونکہ وہ میری خالہ کا لڑکا تھا۔ اس لیے مجھے یہ اُمید تھی کہ ضرور ایک دن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ مگر دل کی حسرت دل میں رہ گئی۔ کاش! تم مجھ پر اعتبار نہ کرتی۔ میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔

تم نے اپنا گھر تو بنا لیا۔ مگر اسلم پاگلوں کی طرح پھرتا ہے۔ اور مجھ سے ان کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ تم جانتی ہو۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ خلاف توقع شوہر نے مجھے بے حد پیار دیا اور دنیا کی کونسی ایسی چیز ہے جو مجھے نہ ملی ہو۔ مگر دل کا سکون نصیب میں نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ میں نے دو دلوں کا قرار چھینا ہے۔ اب ہر لمحہ اپنے آپ کو کوستی ہوں۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔ اور میری موت کے لیے دعا مانگو۔ بھائی جان کو

سلام کہنا اور بیٹے کو بے شمار پیار۔

فقط۔ سجیدہ

نسیم کا غصّہ کے مارے بُرا حال تھا۔ اس نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کھڑکی سے باہر پھینک دیئے اور بُت بنی بیٹھی تھی شاید ماضی کے حسین خوابوں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ معاف کرنا ڈارلنگ آج مجھے دیر ہو گئی۔ اور تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا۔ "ارشد کی آواز خاموش کمرہ میں گونجی" دیکھو! میں تمہارے لیے کتنا اچھا ناول لایا ہوں۔ تم اسے پڑھو۔ میں اتنے میں کپڑے تبدیل کر لیتا ہوں۔ نسیم نے دوسرا صفحہ کھولا۔ اور اس کا انتساب پڑھنا شروع کیا۔

"اس کے نام جس نے میری محفل کو آراستہ کیا لیکن خود کسی دوسرے کی محفل کی زینت بن گئی۔ جو مجھے اُمیدوں کے روشن چراغ دکھا کر ناکامی کی اندھیری کوٹھری میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ جس نے میرا سکھ اور چین سب کچھ چھین لیا۔ اور مجھے شرابی بنا دیا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ اتنی بڑی سزا مجھے کِس جرم میں دی گئی۔ ناول نسیم کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اور ارشد نے نسیم کو کتنی آوازیں دیں مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

پہلے اس نے سوچا کہ شاید مذاق کر رہی ہے مگر اسے بعد

میں معلوم ہوا کہ اس کی رفیقۂ حیات کتنی دیر ہوئی اُسے الوداع کہہ چکی ہے۔ اور ہمیشہ کی نیند سو چکی ہے۔ اور یہ بات سب کے لیے معمّہ بنی تھی کہ مسز ارشد کا ایکا ایک ہارٹ فیل کیسے ہو گیا؟

"پارسٹ"

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی اب تو صرف چار گھنٹے آنے میں رہ گئے تھے اور وہ —— فخر اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے ..... جلدی جلدی گھر کو ٹھیک کرنے لگی۔ کبھی ڈرائننگ روم میں جاتی اور کبھی بیڈ روم میں چیزوں کو ڈھنگ اور سلیقے سے رکھ رہی تھی۔ اسے بہت سارا کام تھا۔ وہ آئیں گے تو کیا محسوس کریں گے۔ اور پھر کافی ٹائم اس کا فرخندہ نے ضائع کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا بھی کتنا نالائق ہے۔ ماں کی ایک نہیں سنتا اور لڑکی ابھی بہت ہی چھوٹی ہے۔ وہ پڑھتا بھی نہیں

اور کہیں نوکری میں بھی جی نہیں لگتا۔ کتنی دُکھی ماں ہے۔ باپ سر پر نہیں اور اولاد بھی نالائق ۔ آج بھی اس کی ماں کہہ رہی تھی۔ کہ یہ لڑکا کہیں نوکری نہیں کرتا۔ بڑی مشکل سے نوکری ملتی ہے، بس دو دن بعد کہتا ہے کہ میں کام پر نہیں جاؤں گا۔ اس کے سوا میرا کون ہے۔ لیکن قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے ۔ ہاتھ دیکھنے والے نے کہا تھا کہ یہ لڑکا بہت قسمت والا ہے۔ مگر میں سوچنے لگی ہوں کیا ہاتھ دیکھنے والے کی بات سچ ہوتی ہے کیا یہ انسان کی تقدیر کی لکیر پڑھ سکتے ہیں۔

فرخندہ کے جانے کے بعد وہ ایک سوچ میں پڑ گئی اگر اس کا بیٹا کام چور ہے۔ لاپروا ہے۔ تو اس میں تقدیر کا کیا قصور ہے، پھر وہی خیالوں کا ہجوم لیکن اسے خیالوں میں اُلجھنے کی فرصت کہاں۔ مگر اس کی بچپن کی عادت نہ گئی، معمولی اور چھوٹی سی بات پر کتنی دیر تک غور کرنا اور سوچنا۔

وہ کھڑکی کے قریب کھڑی سامنے باغ میں پھولوں کی کیاریوں میں تیز دھوپ کو چمکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے اب درختوں کے سائے پھیل رہے تھے۔ اُسے فرخندہ کا خیال آیا۔ دو سال کی بات ہے کہ اس کا شوہر برقی رو کی زد میں آکر مر گیا تھا۔ اب اس کا ایک ہی لڑکا ہے۔ وہ اسے مزید سمجھا کر ماں کا خیال کرنے کو کہے گی ۔ لیکن اس سے ہاتھ کی لکیریں

پڑھنے والوں نے کہا ہے کہ وہ کہیں قدم ۰۰۰ اُف پھر وہی خیال وہی سوچ وہ تو بھول چکی ہے۔ اس بات کو وہ اب ان درویشوں اور پامسٹوں کی بات پر یقین نہیں رکھتی، ہاتھ کی لکیریں تقدیر کی لکیریں ہیں. جب سے اس کی شادی قمر فاروقی سے ہوئی ہے، اس کی تقدیر روشن ہو گئی ہے۔اس کے ارمانوں کے گلاب کھل اٹھے ہیں۔ وہ بہت خوش ہے اور اس کی زندگی کا ہر لمحہ خوشیوں اور رنگینیوں سے معمور ہے۔

قمر فاروقی نے ساری دُنیا کی خوشیاں اس کے قدموں میں رکھ دی ہیں اور گھر کی ملکہ نہیں بلکہ اپنے دل کی ملکہ بھی بنایا ہے کئی رنگین لمحے سرسرا کر اس کے خیالوں میں پگھل گئے۔

اسے وہ دن یاد آگیا جب زوردار بارش ہو رہی تھی اور اچانک چھاؤنی کے علاقے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ اور اس نے ماڈل ٹاؤن جانا تھا۔ پھر اس نے قریبی دفتر میں جا کر فون کرنے کی کوشش کی تو فاروقی کو دفتر میں دیکھ کر اس نے التجا کی میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ پلیز اگر ایک فون کرنے کی اجازت دے دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔

اور فاروقی نے بڑے خلوص سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ تب فاروقی نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی سے چائے لانے کو کہا۔ اور نسرین نے کہا اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے۔ تب

اس نے جواباً کہا۔ خدا کا حکم ہے، سردی کا موسم ہے۔ لہٰذا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

اتنے میں چائے آ گئی نسرین نے جلدی سے چائے ختم کی اور بجائے شکریہ ادا کرنے کے کہنے لگی۔ آپ کی محبت اور یہ سوچ کر کہ کیا کہہ گئی ہے۔ اس کے الفاظ حلق میں پھنس گئے اور بغیر کچھ کہے ہوئے باہر آنے لگی تو فاروقی نے یہ کہہ کر بارش بہت تیز ہے۔ رُک جائیے تو چلی جائیے گا۔ اس کو پھر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور نسرین کے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ تب فاروقی کہنے لگا موسم کتنا حسین ہے۔ مگر آج میرا دل اتنا ہی اُداس ہے۔ اللہ نے دولت بھی بہت دی ہے۔ لیکن زندگی ویران ہے۔ خیر چھوڑیئے آپ کو دیکھ کر——"

دیکھئے میں بیوہ ہوں اور میرا گھر اُجڑ چکا ہے۔ میں کوئی کنواری لڑکی نہیں ہوں جو آپ ایسے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔ دُنیا کیا کہے گی۔ آپ کیوں ایسا سوچ رہے ہیں۔ خاتون! مجھے سب معلوم ہے۔ اور آپ کو میں آج ہی نہیں کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ ٹی وی پر آپ کی خوبصورت تصویر دیکھی ہے۔ مگر آپ نے میری بدقسمتی کو نہیں دیکھا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ نے مجھے اب تک نہیں پہچانا ہے۔

وہ پگھل کر رہ گئی۔

اور سال ہی کے اندر وہ اس کے گھر آئی اس کی دلہن بن کر۔
فاروقی نے اُسے ٹوٹ کر چاہا۔ اِسے اتنی محبت دی جس کا کبھی
وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ بس اسے تو اس کے خوابوں کا شہزادہ مل
گیا تھا جس کا اکثر وہ تصور کیا کرتی تھی۔

شادی کے بعد پہلی مرتبہ فاروقی اکیلے کراچی گیا تھا۔

ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن ٹن۔ ٹن۔

کلاک نے چھ بجائے۔

اس نے جلدی سے الماری کھولی اور خوبصورت سی کام والی ساڑھی
اور ہلکا سا زیور بھی پہننے کے لیے نکالا۔ اور ابھی تیاری کر ہی رہی
تھی کہ ڈرائیور نے دستک دی۔

کون ہے ——— ؟

میں ہوں طارق۔

بیگم صاحبہ میں اسٹیشن جا رہا ہوں۔ ساڑھے چھ بجے گاڑی نے آنا
ہے۔ سوچا آپ کو اطلاع دیتا چلوں۔

طارق صاحب اب فوراً چلے جائیں۔

وہ چلے گے۔

جانتی ہیں آپ ہاتھ دیکھنے والے نے کیا کہا تھا۔ فرخندہ کے
الفاظ پھر اس کے دماغ میں جاگ اُٹھے۔

یہ چڑیل آج ہی اس کے گھر گئی تو ان پر سارا دن بھاری

ہو گیا۔ بچہ خدا جانے کون اٹھا کر لے گیا۔

جہاں جاتی ہے کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آتی ہے۔ وہ بات اچانک اسے یاد آ گئی تھی۔ ایک دل ہلا دینے والی آواز کہہ رہی تھی۔ اور خاموشی میں کئی بھنور پڑ رہے تھے۔ تمہاری زندگی ایک سیاہ رات ہے۔ تم جس سے شادی کرو گی وہ تم سے بہت دور چلا جائے گا۔ تمہارا سہاگ اُجڑتا رہے گا۔ تمہاری تقدیر کی لکیروں میں ہمیشہ بیوہ کے آنسو ہیں۔ یہ میں نہیں تمہاری ہاتھوں کی لکیریں کہہ رہی ہیں۔ تم سدا ——" یہ بات نسرین کو ایک پامسٹ نے کہی تھی۔ نسرین کی پہلی شادی ہوئی اس کے گھر میں کیا کمی تھی۔ مگر طلاق مل گئی۔ اور پھر دوبارہ اس نے والدین کی ضد پر شادی کی تب بھی یہی کچھ ہوا۔ یہ بھی اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر قسمت کے چکر اور کچھ۔ کچھ پامسٹ کی کہی ہوئی بات اپنی سچائی دکھانے لگی۔

اس پر جو گزرتی وہ تو وہی جانتی تھی۔ مگر عورتوں کے طعنے یہ ڈائن ہے ڈائن۔ سال بھی مشکل سے گزرتا ہے اس کا سایہ ہی منحوس ہے۔ یہ چڑیل ہے۔ اور وہ بیچاری زہر بھرے نشتر کو خاموشی سے پی جاتی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ دُنیا بھی چین نہیں لینے دیتی۔ ادھر والدین پر بھی بوجھ بنی بیٹھی ہے تو اس نے فاروقی سے تیسری شادی کی حامی بھر لی۔ اور خاوند پر

مر مٹی۔ اور ایک بار پھر وہ زہریلے الفاظ بھول چکی تھی۔ لیکن وہ بہت گھبرائی ہوئی ان کے آنے کی منتظر تھی۔

اچانک نوکر نے آواز دی اور وہ اپنے ہاتھ کی انگلیاں توڑنے لگی۔ الجھی الجھی لکیریں۔ وہ لکیروں کے بھنور میں ڈوب گئی۔

میں نے کہا بیگم صاحبہ! چاول بھی پکانے ہیں؟

اچھا تم چلو میں ابھی باورچی خانے میں آتی ہوں۔

کچن میں اس نے تمام پکی ہوئی چیزوں کو دیکھا۔

اُسے زندگی کا پھر سے احساس ہوا۔ ماضی کے دھندلکوں میں تحلیل ہوا ہے۔ دھندلکے کچھ بھی نہیں اور حال ایک حقیقت ہے۔ وہ جی رہی ہے۔ وہ دولت میں کھیل رہی ہے، اور فاروقی کا پیار بھی اسے حاصل ہے۔ اور اسے کیا چاہیئے وہ آئیں گے تو خوش ہونگے وہ دروازے پر آتے ہی اسے پکاریں گے۔ اُسے سینے سے لگائیں گے۔ کتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ چند دن اس نے کس بے چینی سے گزارے۔ بالکل ان کی بھی وہ حالت ہوگی جو میری بے قراری تھی۔

ٹن ——— پورے سات بج گے۔ اب ٹرین آنے والی ہوگی اس کے دل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ ایک ایک منٹ سو سو سال کے برابر ہو رہا ہے۔ اچانک اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا ہو گیا اسے وہ آتو رہے ہیں اور خدا کے کرم سے اچھے ہوں گے خواہ مخواہ

پریشان ہو رہی ہے۔ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی تو سات بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے۔ اس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں پھر دیوار پر لگی فاروقی کی تصویر دیکھنے لگی۔ اس کی چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نسرین کی فاروقی نے چوری پکڑ لی ہو۔ وہ پھر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ ہوا میں قدرے خنکی آ گئی اور وہ بل کھاتے ہوئے راستوں پر کھو گئی۔

ٹن ۔ ٹن ــــــ کلاک نے آٹھ بجایا۔ وہ ٹرین کے دروازے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ٹرین رکی۔ ٹرین تھوڑی دیر سے پہنچی ہے، طارق نے خوش آمدید کہا۔ اب وہ گاڑی میں بیٹھے اور چھاؤنی کی طرف آ رہے ہیں۔

نہیں، نہیں امی کو ملنے ماڈل ٹاؤن گئے ہوں گے۔ وہ بڑی بے قراری کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ راستہ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک سی گئیں۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔ وہ کیوں نہیں آئے، کہیں خدانخواستہ ــــــ اُف وہ سر تھام کر رہ گئی۔ اب اگر ایسا ہو گیا تو وہ زندہ نہیں رہے گی۔ اسے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ اب ایسا وہ کیوں سوچتی ہے۔ کیا وہ پاگل ہے؟

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھی اور اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا۔

ہیلو۔ جی۔ جی ہاں طارق صاحب آپ گھبرائے سے کیوں ہیں؟

خیبر میل ——— ایکسیڈنٹ ——— ستّو آدمی مارے گے۔ ہائے اللہ۔ نہیں اس کی چیخ نکلی۔ وہ چکرا کر زمین پر گر گئی چند تاریک لمحے گزرے،

تمھاری زندگی ایک سیاہ رات ہے۔ تم جس سے شادی کرو گی وہ دُور بہت دُور تم سے چلا جائے گا۔ تمہارا سہاگ اُجڑتا رہے گا۔ تمہاری تقدیر کی لکیروں میں ہمیشہ بیوہ کے آنسو ہیں ——— یہ میں نہیں تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں ——— اس کے ہاتھ کی لکیریں چیخ رہی تھیں،

نہیں ——— نہیں ——— اب ایسا نہیں ہو گا۔ وہ وحشت اور دیوانگی کے عالم میں اٹھی۔ اس کا لرزتا ہوا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی چھن گئی ——— وہ لڑکھڑاتی ہوئی پلنگ کی طرف لپکی۔ لیکن دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

خاموشی گہری ہو گئی۔ گھڑی نے دس بجائے،

کہاں ہو نسرین؟ ——— میں آگیا ہوں بھئی ذرا دیر ہو گئی ٹرین لیٹ تھی۔ کیونکہ راستے میں خیبر میل کے ساتھ ایک بھینس ٹکرا گئی تھی۔ اس لیے کافی دیر رُکنا پڑا۔

نوکر کہاں ہیں۔ یہ اندھیرا کیسا ہے۔ اور جب اس نے سوئچ آن کیا تو کیا دیکھا کہ نسرین بے حس و حرکت زمین پر پڑی

ہے۔ اس نے جلدی سے اس کو اٹھایا۔ اور جب وہ ہوش
میں آئی تو کسی گہری سوچ میں تھی۔

دوپہر کا نواب

رات کی تنہائی کاشف کو ڈسے جا رہی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی نے موسلا دھار بارش کی صورت اختیار کر لی تھی اور وہ نہایت بے چینی سے بیڈ پر پڑا سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے اس مکان میں کافی آرام تھا۔ لیکن بعض اوقات اسے بہت بوریت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ اتنی بڑی کوٹھی میں بالکل تنہا آدمی عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ اور پھر اسے یہاں کی بہت سی چیزوں کے متعلق کچھ علم بھی نہ تھا۔ ایک سے ایک مہنگی اور عجیب و غریب چیزیں یہاں

موجود تھیں اور کئی چیزیں تو ایسی تھیں جن کا ذکر تک اُس نے نہیں سُنا تھا اور اب اس کی نظروں کے سامنے تھیں۔ ان چیزوں کو کافی دیر تک دیکھتا رہا لیکن پھر بھی سمجھ نہ پایا کہ وہ کیا شے ہے۔ تنہائی سے گھبرا کر اس نے سوچا کہ کوٹھی کو چوکیدار کے حوالے کر کے خود باہر چلا جائے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کو اپنے دوست سلیم کا خیال آ گیا جس کے کہنے پر اس نے کوٹھی پر رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور سلیم بھی اپنی کوٹھی کے علاوہ کار اور گھر کی تمام اشیاء اس کے آرام کی خاطر چھوڑ کر گیا تھا اور کاشف ایک حد تک مطمئن تھا کہ اُسے سونے کے لیے آج نرم نرم بستر مل رہے ہیں اور چند دن کے لیے اسے ٹوٹی ہوئی چارپائی اور پھٹے ہوئے بستر سے نجات مل گئی ہے۔

وہ یونہی بستر پر پڑا اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے سوچا کہ اس وقت بھلا کون ہو سکتا ہے۔ اور یہ سوچ کر وہ بستر پر لیٹا رہا۔ لیکن جب دوبارہ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ بستر سے اٹھا اور دروازہ کھولا۔

اس نے اپنے سامنے ایک اجنبی دوشیزہ کو کھڑا ہوا پایا جو سر سے پاؤں تک بارش میں بھیگ چکی تھی۔

آپ کون ہیں۔ اس نے برجستہ سوال کیا۔

لڑکی نے سہمے ہوئے انداز سے جواب دیا۔
میں کالج سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں بارش نے شدت اختیار کر لی۔ اور میں نے بہت مجبوری میں آپ کی کوٹھی میں پناہ لی۔
لیکن آپ اتنی رات گئے کالج سے واپس آ رہی تھیں۔ کاشف نے پوچھا۔
جی ہاں! ہمارے کالج میں فنکشن تھا جس کی وجہ سے مجھے دیر ہو گئی اور کوئی ایک گھنٹے سے تو آپ کی کوٹھی کے عقب برآمدے میں کھڑی بارش رکنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اور جب سرتاپا بھیگ گئی اور سردی محسوس ہونے لگی تو دروازے پر دستک دینا پڑی۔
ارے آپ تو اب تک بھیگ رہی ہیں۔ آیئے اندر آ جائیں۔
یہ سن کر لڑکی کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے اب بھی پانی کے قطرے قالین پر ٹپک رہے تھے۔
آپ تو مکمل طور پر بھیگ چکی ہیں۔ آپ ایسا کریں کہ میری یہ شرٹ اور پتلون پہن لیں۔
فی الحال تو یہی ہے اس طرح آپ بیمار ہونے سے بچ جائیں گی۔
لڑکی نے ایک نظر کاشف کے چہرے پر ڈالی اور بھرپور جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ آپ کے پاس اور کوئی نہیں رہتا۔
کیا مطلب ہے آپ کا۔
مطلب یہ کہ۔۔۔۔۔ وہ

اچھا میں سمجھا۔ نہیں محترمہ ایسی کوئی بات نہیں ابھی تک تو فی الحال اکیلا ہی ہوں۔ آپ اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلے رہتے ہیں۔ اس نے یہ کہا اور شرٹ پتلون ہاتھ میں لیے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

جی ہاں میں اس کوٹھی میں تنہا رہتا ہوں۔ اور اب بھی اپنے لیے چھوٹی ہی تصور کرتا ہوں۔ اتنی دیر میں لڑکی ڈریس تبدیل کرنے کے بعد باہر آئی تو اس کا حسن اور بھی نکھر چکا تھا۔

آپ چائے پئیں گی؟

مگر اس وقت چائے بنائے گا کون۔ نوکر تو ہے نہیں۔

آپ اس کی فکر نہ کریں یہ کہتے ہوئے اس نے قریب ہی پڑی کیتلی کو ہیٹر پر رکھا اور چائے تیار کرنے لگا۔

آپ رہتے تو تنہا ہیں لیکن یہاں تو کئی بیڈ لگے ہوئے ہیں

ارے بھئی کیا پوچھتی ہیں بعض دوست بے چارے بہت غریب ہیں جب کھانے کو ٹکڑا اور سونے کی جگہ نہ ملے تو میرے پاس چلے آتے ہیں اور یہ سب کچھ انہی کے لیے ہیں۔ اگر اپنے سے کسی کو فائدہ پہنچ جائے تو کون سی بری بات ہے۔

لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی اور کتابوں سے بھری ہوئی شیلف کی جانب بڑھ گئی۔ ارے بھئی آپ تو کافی باذوق معلوم ہوتے ہیں آپ کی شیلف میں تو غالب اور ساحر سے لے کر فیض تک کی کتابیں ہیں۔

کاشف نے یہ سنا تو ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ ماؤف ہو

گیا اور وہ سوچنے لگا یہ غالب، ساحر اور فیض کیا بلا ہیں۔ اور پھر بات کو ٹالتے ہوئے بولا۔

لیجئے چائے تیار ہے۔ آپ کو سردی محسوس ہو رہی ہو گی چائے پیئیں۔ اس نے کپ لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔

میرا نام نغما ہے۔

نغما۔ اس نے نام کو دوبارہ دہرایا اور بولا بارش تو ہر لمحے تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کے گھر والے پریشان ہوں گے۔

جی ہاں۔ پریشان تو ہوتے ہی ہوں گے ویسے میں نے انہیں کالج سے فون کیا تھا کہ فنکشن کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔

آپ چاہیں تو آج کی رات یہاں بسر کر سکتی ہیں۔ کاشف نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

آپ کی بہت بہت مہربانی مجھے ابھی واپس جانا ہے کیونکہ گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن باہر تو بہت زور کی بارش ہو رہی ہے۔

کوئی بات نہیں میں بارش میں ہی چلی جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی۔

کاشف نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا کچھ سوچا اور یک لخت اس کے لبوں پر ایک شوخ سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس

نے نغما کو آواز دی۔

نغما ــــــ سُنو تو ــــــ

نغما کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے اسے اس آواز میں دنیا بھر کی مانوسیت محسوس ہوئی۔

آپ ایسے بھیگی ہوئی کہاں جائیں گی۔ ٹھہریں میں گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔ کاشف نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی

نہیں! آپ کی بہت بہت مہربانی میں چلی جاؤں گی۔

ارے اتنی ہی کیا بے رُخی میں ابھی گاؤن پہن کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ کمرے میں گیا۔ اور الماری سے چابیاں تلاش کرنے کے بعد گیرج کی طرف بڑھا اور سلیم کی گاڑی نکال لایا اور نغما کو بٹھا کر نہایت شان سے گاڑی چلانے لگا۔

آپ کی گاڑی تو بہت خوبصورت ہے۔

اسے اپنی ہی سمجھیں خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے بس اگر اس زندگی میں کمی ہے تو صرف ایک پیار کرنے والی بیوی کی۔ آہ! ہمارے ایسے مقدر کہاں؟ کاش آپ کی طرح خوبصورت بیوی مل جائے۔

اچھا چھوڑیں۔ ان باتوں کو آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔

جی ادھر سے سیدھے مارکیٹ کی طرف لے لیں۔

کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں!

کیوں نہیں۔ مجھے کاشف کہتے ہیں اور میں قالینوں کی درآمد برآمد کا کام کرتا ہوں۔

ویسے آپ کے خیالات بہت بلند ہیں ایسے لوگ تو آجکل ملنے بہت مشکل ہیں۔ یونہی باتیں کرتے کرتے نغما نے اُترنا چاہا کیونکہ اب اس کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ آگے راستہ کچا تھا۔ جہاں گاڑی کا جانا محال تھا۔ کاشف نے اُسے وہیں اُتارا اور آئندہ ملنے کا وعدہ لے کر کوٹھی واپس آگیا۔

پھر روز بروز ان کی ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بن گئے۔ وقت کا دھارا، محبت کی قسموں اور وعدوں میں بندھ گیا۔

کالج ایک ہفتہ کی تعطیل کی وجہ سے بند ہو گئے۔ اور نغما کاشف سے مل نہ سکی۔ دوبارہ کالج کھلنے پر جب نغما کاشف کی کوٹھی پہنچی تو باہر سے اُسے کئی لوگوں کی ہلنسی مذاق کی آوازیں سنائی دیں۔ بہرحال اس نے ہمت کر کے کال بیل دی تو سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔

پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

جی! مجھے کاشف صاحب سے ملنا ہے۔

بھئی آپ کس کاشف صاحب کا ذکر کر رہی ہیں۔ یہاں تو اس نام کے کوئی صاحب نہیں ہیں۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جی نہیں، میں ٹھیک ہی کوٹھی میں داخل ہوئی ہوں۔ اور اس سے پہلے بھی کئی بار یہاں آچکی ہوں۔

ابھی چند روز پہلے تو یہاں رہا کرتے تھے اور پھر نعمانے کاشف کا حلیہ بیان کیا۔

اچھا اچھا وہ خیر دین۔ اس نے آپ کو اپنا نام کاشف بتایا ہے کیا؟

کیا کام ہے آپ کو ان سے؟

جی کام تو ان سے ہی ہے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہوں گے۔

محترمہ۔ ابھی کا تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ دھندا تو کرتا کوئی نہیں ہے۔ اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

جی! یہ کوٹھی۔ کار وغیرہ وغیرہ۔

محترمہ یہ میری کوٹھی ہے اور میں کئی سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔ صرف چند دنوں کے لیے غیر ملک جانے کی وجہ سے میں نے یہ کوٹھی دیکھ بھال کی خاطر اپنے دوست خیر دین کے حوالے کی تھی۔

نعما کے پیر تلے زمین نکل گئی۔

اک دم کچھ سوچ کر بولی۔ اچھا اچھا زحمت کی معافی چاہتی ہوں۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ آخر یہ کیا ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ خیر میں اسے ضرور تلاش کروں گی۔

اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ ایک دن اچانک کاشف کو اس نے

راستے میں دیکھ لیا۔
لغما تم کہاں چلی گئی تھی۔ میری دنیا اندھیری کر گئی تھی۔
میں کیا بتاؤں کہ میں کتنا اُداس ہو گیا تھا۔ کاش تم میری بے بسی دیکھ سکتیں۔ جان تم نے یہ ظلم کیا سوچ کر کیا دیکھو میری کیا حالت ہو گئی ہے۔

لغما دل ہی دل میں کہنے لگی۔ جی دل اداس ہونا ہی تھا۔
پھر بولی اچھا اچھا اب سناؤ کیسے ہو۔ چلو گھر چلیں۔
نہیں جان تمہیں کیا پتہ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ کیوں بھئی۔ اچانک میرے بڑے بھائی اور بھابھی آ گئے اور بھابھی نے امی کے حکم کے مطابق میری شادی طے کر دی۔

اس نے ماچس جلاتے ہوئے کہا۔ مجھ سے جلتی ہے اور اسی لیے میری محبت تو تم ہو۔ بھلا میں ان کی بات کیسے مان لیتا اس لیے آج کل میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں تاکہ ان کو پتہ چلے کہ میں بھی کما کر زندہ رہ سکتا ہوں۔ اسی لیے آج تم مجھے پیدل دیکھ رہی ہو۔ میں نے غصہ میں گاڑی بھی وہیں چھوڑ دی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں میں دولت کے پیچھے آ جاؤں گا۔ مگر میرا نام بھی کاشف ہے۔ میری رگوں میں بھی اسی خاندان کا خون ہے۔ اگر وہ ضد کر رہے ہیں تو مجھے بھی ضد کرنا آتی ہے۔ اس وقت تک گھر واپس نہیں جاؤں گا جب تک وہ میری بات نہیں مانیں گے۔

نغما اک دم بولی۔ مسٹر خیر دین میں بچہ نہیں ہوں۔ اب یہی بہتر ہے کہ میں آئندہ آپ کی شکل نہ دیکھوں۔ لیکن تم نے محبت کے جو وعدے کیئے تھے اور قسمیں کھائی تھیں وہ کیا ہوئیں؟ تو کیا تمہیں مجھ سے اب بھی محبت کی اُمید ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ وہ ایک سراب تھا۔ وہ قسمیں اور وعدے تمہاری نوابی کے بوجھ تلے دب گئے

جاؤ اسی وقت میری نظروں کے سامنے سے د-ف-ع ہو جاؤ۔ میں تم جیسے مکار، دغاباز اور جھوٹے انسان کی صورت ایک پل بھی دیکھنا گوارہ نہیں کرتی۔

نغما نے یہ کہا اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی چل دی۔
